188755

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_188745
UNIVERSAL
LIBRARY

Osmania University Library

Call No.

Accession No. 3810

Author

Title

This book should be returned on or before the marked below.

سیّد الانبیاء

(یعنی)

ٹامس کارلائل کی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کے دوسرے لکچر کا

(اردو ترجمہ)

از

محمد اعظم خان

قیمت مجلد (۱عہ) کلدار

نذر

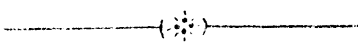

بہ بارگاہ رسالت پناہ روحی فداک

اے کہ در مدحت نہ تنہا دوستاں رطب اللسان

دشمنان ہم پیش پائے تو سپر انداختند

مقدمہ

قاعدہ کی بات ہے کہ جب انسان کا بس زور و قوت سے نہیں چلتا تو وہ مکر و فریب سے کام لیتا ہے، مکر و فریب اور کذب و افترا دراصل کمزوری کی علامت اور شکست کا اعتراف ہے۔ تاریخ عالم کے اوراق اس انسانی کمزوری کی مثالوں سے بھرے ہوئے ہیں جس میں سے صرف ایک واقعہ کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

ساتویں صدی عیسوی میں بادیہ نشینان عرب کی بیداری، تاریخ ارتقا کا وہ حیرت انگیز واقعہ ہے جس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ اس واقعہ سے جہاں ان خانہ بدوش قبائل کی عظیم الشان ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ وہیں انکی ہمسایہ قومونکی وہ افسوسناک کمزوری بھی ظاہر ہوتی ہے جسکا اوپر ذکر ہوا چنانچہ جب مسیحی بادشاہوں اور مقتداؤں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا بڑھتا ہوا سیلاب ان کے ملک و مذہب کو

خس و خاشاک کی طرح بہا لیجا رہا ہے۔ جس کے مقابلہ میں ان کے افواج و عساکر
اور دلائل و براہین سب بیکار ہوئے جاتے ہیں۔ تو انھوں نے اسی کذب و افترا
کے حربہ سے کام لینا شروع کیا اور عوام کے دلوں میں تعصب و عداوت کا ایسا
بیج بویا جو صدیوں تک نشو و نما پاتا رہا۔ اگرچہ اب ایک عرصہ سے اس شجر تعصب
میں پت جھڑ شروع ہو گئی ہے۔ اور آج مارگولیتھ کی طرح کے دو چار سے زیادہ ثمر
اس پر نہیں نظر آتے لیکن جس زمانہ میں کارلائل نے یہ لکچر دیا ہے وہ اس درخت کی
بہار کا تھا۔ جبکہ اسکی ہر شاخ پر ڈاکٹر وائٹ اور ڈاکٹر مور کی طرح کے بہت سے حنظل
موجود تھے۔ اس زمانہ میں اسلام وہ قہر آسمانی بتایا جاتا تھا جو مسیحیت کو نیست و نابود
کرنے کیلئے نازل ہوا ہو۔ کارلائل کے سامنے اسلام کے متعلق جو کچھ مواد تھا وہ زیادہ تر اسی
قسم کا تھا کہ "محمد لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا ہے ......
مسلمانوں کا دیوتا اپلین وہاں ایک غار میں تھا ..... مسلمانوں کے دوسرے دیوتا ماہم
کو انھوں نے ایک گڑھے میں ڈالدیا جسے سوروں اور کتوں نے نوچ ڈالا"۔ وقس علی ہذا۔
ایسے عہد میں جبکہ تعصب کی گھٹا ہر طرف چھا رہی ہو۔ اور عداوت کی آگ ہر سینہ

میں بھڑک رہی ہو آفتاب صداقت کو دیکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ اور دکھانا مشکل تر۔ یہ صرف اُس شخص سے ممکن ہے جو کارلائل کی طرح چشم بینا اور ہمت مردانہ رکھتا ہو، چنانچہ جس جرأت سے وہ اس طلسم باطل کو توڑتا ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو وہ کہتا ہے کہ "محمدؐ کے متعلق ہمارا یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے کہ وہ دغاباز اور کذب مجسم تھے اور ان کا مذہب محض فریب و نادانی کا ایک مجموعہ ہے۔ کذب و افترا کا وہ انبار عظیم جو ہم نے اپنے مذہب کی حمایت میں اس ہستی کے خلاف کھڑا کیا خود ہمارے لئے شرمناک ہے..... اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ آج بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ انسانوں کے حق میں شمع ہدایت کا کام دے رہے ہیں..... کیا ہم کسطرح اسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ کہ یہ سب روحانی بازیگری کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا جس پر اتنے بندگانِ خدا ایمان لائے اور گذر گئے؟..... افسوس! ایسے نظریے سخت افسوسناک ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑھکر ملحدانہ نظریہ اس دنیا میں آجتک نہ قائم کیا گیا ہوگا ایک جھوٹا آدمی اور کسی مذہب کا بانی ہو! جھوٹا آدمی اینٹ اور چونے کا ایک مکان تو بنا نہیں سکتا۔ اگر کسی شخص کو اُن اشیاء کے خواص کا صحیح علم نہ ہو جو تعمیر مکان

میں کام آتے ہیں تو اس کا بنایا ہوا مکان مکان نہ کہلا سکیگا بلکہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا
ایسا مکان بارہ صدی تک قائم نہیں رہ سکتا اور نہ اوسمیں اٹھارہ کروڑ انسان سما سکتے ہیں

ایک اور جگہ آنحضرتؐ کے متعلق وہ اسطرح گہرا نشانی کرتا ہے۔ "ہم کسی طرح
حضرت محمدؐ کو حریص و منصوبہ باز اور اُن کے تعلیمات کو جہل و نادانی نہیں سمجھ سکتا
وہ امیانہ پیغام جو آپ لیکر آئے تھے بالکل سچا تھا وہ ایک آواز پریشاں تھی جو پردۂ
غیب سے بلند ہوئی اُس شخص کے نہ اقوال جھوٹے تھے نہ افعال۔ اس میں تنگ
ظرفی اور نمایش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ زندگی کا ایک جلوۂ تاباں تھا جو خاص
سینۂ فطرت سے ہویدا ہوا اور جسے خالق عالم نے کائنات کو منور کرنے کیلئے بھیجا تھا
محمدؐ کی لغزشیں۔ کمزوریاں۔ حتی کہ ان کی ریاکاریاں بھی (اگر وہ کبھی ثابت ہو
بھی جائیں) اُن کے متعلق اس بنیادی حقیقت کو متزلزل نہیں کر سکتیں"

اسی طرح کے اور بہت سے مقامات اس لکچر میں ایسے ہیں جنسے کارلائل
کے فوق العادۃ جوش اور غیر معمولی جرأت کا پتہ چلتا ہے اور جن پر نظر کرتے
یہ کہنا مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ مذہب عیسوی کی تاریخ میں وہ پہلا شخص تھا

جسنے نیک نیتی کے ساتھ اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ؛

اس میں شبہ نہیں کہ آئندہ صفحات پر ہمیں بعض خیالات ایسے بھی ملتے ہیں جو اس لکچر کی عام اسپرٹ سے مناسبت نہیں رکھتے۔ ایسے مقامات دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جہاں مقرر نے صداقت کی روح کو پا تو لیا ہے لیکن اس کے بے باکانہ اظہار میں مصلحت مانع آتی ہے اور سامعین کے جذبات کا پاس دامنگیر ہوتا ہے مثلاً شروع ہی میں کارلائل کہتا ہے کہ "ہم نے محمدؐ کا انتخاب اس لئے نہیں کیا کہ وہ افضل ترین پیغمبر ہیں" حالانکہ ہیروز کے اس سلسلہ کیلئے انکا انتخاب خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ آپ کو افضل ترین پیغمبر سمجھتا تھا۔ لیکن مصلحت وقت اجازت نہیں دیتی تھی کہ مسیحؑ پر محمدؐ کو ترجیح دیجائے اور پھر انکی کوئی تاویل نہ کیجائے۔ اسی طرح شروع میں وہ فقط سامعین کی ہمدردی حاصل کرنے کیلئے کہتا ہے کہ "چونکہ ہم میں سے کسی کے مسلمان ہو جانیکا اندیشہ نہیں اسلئے میں محمدؐ کے وہ تمام اوصاف بیان کر دینا چاہتا ہوں جو انصاف کے ساتھ ممکن ہیں"۔ حالانکہ جب وہ اپنی جادو بیانی کے زور سے سامعین کی ذہنیت کو پورے طور

مسخر کرلیتا ہے تو خاتمہ کے قریب پہنچکر انہی مسلمانوں کے متعلق اسطرح اظہار خیال کرتا ہے
ازمنۂ اولیٰ کے بعد سے آجتک عیسائیوں کا کوئی فرقہ اپنے مذہب کا ایسا
پابند نہیں رہا جیسے کہ مسلمان اپنے مذہب کے۔ وہ اس پر کامل یقین رکھتے ہیں۔
اور اسی پر اپنی دنیا و آخرت کا دارومدار سمجھتے ہیں.... "اللہ اکبر" اور "اسلام" کے الفاظ
ان بیشمار بندگان خدا کے رگ رگ پے میں سرایت کر گئے ہیں۔ اور انکی زندگی کا جزو
لاینفک بن گئے ہیں" لیکن ان مثالوں سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ کارلائل نے
مصلحت کی خاطر صداقت کا خون کر دیا۔ اور کلمۂ حق کے ظاہر کرنے میں کماحقہ
جرأت سے کام نہیں لیا۔ نہیں بلکہ یہ فن خطابت کے وہ اہم گر ہیں جن سے
کوئی تجربہ کار اور فطرت شناس مقرر قطع نظر نہیں کرسکتا۔ سامعین کے ایک
مختلف الخیال مجمع کو اپنا ہمنوا بنانیکے لئے ضروری ہے کہ پہلے پہل اُن کے جذبات
کی بھی تھوڑی سی رعایت کیجائے۔

البتہ اس لکچر کے بعض اجزا ایسے ضرور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ
مواد کی قلت اور ماحول کی ظلمت کے باعث فی الحقیقت مقرر بعض اسلامی

اصولوں کو پوری طرح جذب نہیں کرسکا لیکن اسکے باوجود ہمیں اُس کی نیت پر
شبہ کرنیکی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اگر وہ کہیں عیسائیوں کے کسی اعتراض کو دہراتا
اور اسکی تائید کرتا ہے تو اس کے بعد وہی اس کا جواب دینے اور اس کی تاویل کرنے
سے بھی گریز نہیں کرتا مثلاً اگر ایک جگہ قرآن کو وہ "بے ربط پیچیدہ مغلق
اور مخبوط المعنی" کہتا ہے۔ تو دوسری جگہ خود ہی اس کے متعلق یہ بھی کہتا ہے کہ "قرآن
کے ان بے ربط روایات، الزامات، شکایات اور وظائف میں اصلی اور حقیقی
بصیرت کی ایک ایسی جھلک نظر آتی ہے جسے شاعرانہ لطافت سے تعبیر کرنا
بیجا نہ ہوگا"۔ اسی طرح اگر وہ ایک جگہ یہ کہتا ہے کہ "اسلام میں بہشت و دوزخ کا
جو تصور پیش کیا گیا وہ بڑی حد تک حیوانی ہے جس سے ہمارے روحانی احساسات
سخت مجروح ہوتے ہیں"۔ تو آگے چلکر خود اس کا جواب اس طرح دیتا ہے کہ
"بہشت و دوزخ کا اسلامی تصور خواہ کیسا ہی بھدا اور مادی سہی لیکن ایک
حقیقت جاوید کی ایسی زندہ تصویر ہے جسکی مثال کسی اور جگہ نہیں ملتی"۔
غرض جہاں کہیں اس نے اسلام پر خود کوئی اعتراض کیا ہے یا اور

عیسائی معترضین کی تائید کی ہے وہیں ان اعتراضوں کا جواب دینے اور انہیں رفع کرنیکی بھی کوشش کی ہے برین ہم چونکہ یہ اعتراضات اس لکچر کے اہم اجزا میں سے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اُن پر ذرا تفصیل سے نظر ڈالی جائے ؛

اس سلسلہ میں ہماری نظر سب سے پہلے اُن خیالات پر پڑتی ہے جو کارلائل نے قرآن کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ قرآن کے مطالب کو ہر شخص آسانی سے نہیں سمجھ سکتا لیکن یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ جب ایک معمولی گوشت پوست رکھنے والے انسان کا کلام سمجھنے کیلئے ہمیں متعدد شرح و حواشی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے باوجود بعض دفعہ اُس کے اصلی معنی کا تعین نہیں ہوسکتا اور اس کی مختلف تعبیریں کیجاتی ہیں۔ تو اُس کلام کو بدرجۂ اولے مشکل ہونا چاہئے جو خالق کونین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جس کے متعلق دنیا کی ایک کثیر آبادی صدق دل سے یہ یقین رکھتی ہے کہ وہ اُسی نور مجرد کا ایک مرئی اور محسوس مظہر ہے جس کے پرتو رخ سے اعلیٰ ترین

شعراء کے دل منور ہوتے رہتے ہیں۔ بیچارے سیل کی کیا بساط کہ اُس کا ترجمہ کرتا۔ جس چیز کو وہ خود نہیں سمجھ سکا۔ اُسے دوسروں پر کیا منکشف کر سکتا تھا۔ اس لئے اگر اس کا ترجمۂ قرآن پڑھکر کارلائل نے اُسے "مخبوط المعنی" کہدیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس موقع پر ہم چند ایسی مثالیں پیش کرنا چاہتے تھے جن میں بعض مفسرین نے یہ ثابت کیا ہے کہ کلام مجید کی اکثر آیتیں جو بظاہر بالکل بے ربط اور غیر متعلق معلوم ہوتی ہیں کس طرح ایک ہی رشتۂ معنی میں منسلک ہیں۔ لیکن یہ ایسا وسیع موضوع ہے جو یہاں خاطر خواہ پھیلایا نہیں جا سکتا اس لئے اس بحث کو نظر انداز کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے ؛

دوسرا مقام وہ ہے جہاں اس امر کے متعلق بحث کی گئی ہے کہ "بہشت و دوزخ کا اسلامی تصور بڑی حد تک حیوانی ہے" اگرچہ عیسائیوں کے اس اعتراض کے کئی جواب خود کارلائل نے دیئے ہیں لیکن ان میں سے بعض چنداں تشفی بخش نہیں معلوم ہوتے۔ اس موقع پر یہ دلچسپ نکتہ یاد رکھنے کے

قابل ہے کہ مکافات عمل سے کیا مراد؟ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا
کہ انسان کے ہر فعل کی کچھ نہ کچھ سزا یا جزا ہوتی ہے۔ یہ سزا اور جزا کیا چیز ہے؟
جزا نام ہے اُس نتیجۂ اعمال کا جو انسان کی مرضی کے مطابق ہو اور سزا جو اُسکی مرضی
کے خلاف۔ وہ سزا سزا ہی نہیں جو بدکار کو خوش کردے اور وہ جزا جزا ہی نہیں
جو نیکوکار کو ناراض۔ اب دیکھئے کہ فطرت انسانی کیا چاہتی ہے؟ اعلیٰ غذائیں
لطیف خوشبوئیں حسین صورتیں۔ دلکش آوازیں غرض وہ تمام چیزیں جو اُسکے
حواس خمسہ کو فرحت ولذت بخشیں اور انکی نشوونما میں ممد ومعاون ہوں۔
اس کے برخلاف ایسی تمام چیزوں سے فطرت ابا کرتی ہے جو
ان حواس کو اذیت پہنچائیں اور مضمحل کردیں۔ بس اسی چیز کا قرآن میں لحاظ
رکھا گیا اور یہی بہشت ودوزخ کا اسلامی تصور ہے۔ صرف اس لئے کہ جنت
کی تعریف میں حور وغلماں اور کوثر وتسنیم کا ذکر کیا گیا یہ کہنا کہ وہ حیوانی ہوگئی
دراصل فطرت انسانی کو رسوا کرنا اور اس کے بنانے والے پر معترض ہونا ہے،
اس میں شبہ نہیں کہ انسان میں جسمانی خواہشات سے اعلیٰ تر

ایک جذبہ روحانی کیف و سرور کا موجود ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے جسمانی مطالبات کی تکمیل نہ کیجائے چنانچہ جنت میں جسمانی خواہشات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ روحانی مطالبات کی تکمیل کا بھی وعدہ کیا گیا ہے جیسا کہ خود کارلائل کہتا ہے "جنت کی اعلیٰ ترین نعمت روحانی ہوگی یعنی خدا کا دیدار جو باقی تمام نعمتوں سے بدرجہا افضل ہوگا"

یہی حال دوزخ کا ہے، حمیم و غساق اور نار و زقوم یہ سب کیا ہیں؟ انسانی مطالبات کی خلاف ورزیوں کے مختلف نام ہیں اور بس ؛

عیسائیوں کا تیسرا اعتراض جو اس لکچر میں ظاہر کیا گیا۔ اسلام کے بزور شمشیر پھیلنے کے متعلق ہے۔ کارلائل نے اسکے جواب میں جو کچھ بحث کی وہ اگرچہ نہایت دلچسپ اور فلسفیانہ ہے لیکن اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اس نے اس اعتراض کو ایک حد تک تسلیم کر لیا ہے حالانکہ یہ اعتراض اس قدر بے بنیاد ہے کہ صفحات تاریخ سے اس کی کہیں تائید نہیں ہوتی۔ پروفیسر آرنلڈ آنجہانی نے اپنی بیش بہا تاریخ "دعوت اسلام"

میں نہایت محنت کے ساتھ اُن اسباب وعلل پر روشنی ڈالی ہے جو
مختلف اقطاع عالم میں اشاعت اسلام کا باعث ہوئے اس میں
انہوں نے نہایت وضاحت سے دکھلایا ہے کہ مذہب اسلام کی
اشاعت کا اصلی ذریعہ صرف تعلیم و تلقین اور مسلمانوں کے صفات و
محاسن تھے اور اگر کہیں تلوار استعمال ہوئی ہے تو اس کے اغراض زیادہ تر
سیاسی رہے ہیں نہ کہ مذہبی ؛

اس کے بعد ہم چوتھے اور آخری اعتراض کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو
اسلام کی "مُوس پرستیوں" سے متعلق ہے اور جس سے معترضین کی مراد
غالباً تعدد ازدواج ہے۔ اس بارہ میں ہمیں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت
نہیں معلوم ہوتی۔ قطع نظر ان جوابات کے جو خود کارلائل نے دیئے ہیں
موجودہ زمانہ میں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ تعدد ازدواج کا امتناع
بلا کسی استثنا کے ایسی سخت غلطی ہے۔ جسے ضروریاتِ معاشرت کسی
طرح جائز نہیں رکھ سکتے جن قیود و شرائط کیساتھ اسلام میں تعدد ازدواج

کی اجازت دیگئی ہے انکو پیش نظر رکھنے کے بعد ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس بارے میں کسی سمجھدار آدمی کو اختلاف ہوسکتا ہے، نواب اعظم یار جنگ مرحوم نے اپنے رسائل میں اس مسئلہ پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے اور صراحت کیساتھ ان قیود کا ذکر کیا ہے جنکا نکاح ثانی کے ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ کسی مزید دلیل و حجت کا محتاج نہیں معلوم ہوتا۔

یہی چند مقامات اس لکچر میں ذرا کھٹکتے تھے جن کا اوپر ذکر ہوا لیکن جب ان سے قطع نظر کرکے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کس طرح کارلائل کی نگہ رسا جہل و تعصب کی تاریکیوں میں منزل مقصود تک جا پہنچتی ہے اور کذب و افترا کے انبار سے حقیقت کے جواہر ریزے ڈھونڈھ نکالتی ہے تو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ؎

تا نباشد سوزِ حق در سازِ فکر | نیست ممکن این چنین اندازِ فکر

(اقبال)

محمد اعظم خاں

نصیر دلا۔ عثمان پورہ۔ حیدرآباد دکن

مئی ۱۹۳۱ء

کارلائل پر ایک مختصر نوٹ

انگلستان کا مایۂ ناز ادیب، مؤرخ اور فلسفی تھامس کارلائل ۴ دسمبر ۱۷۹۵ء کو جنوبی اسکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اسکا باپ جیمز کارلائل پہلے ایک معمولی سنگ تراش تھا جسنے بعد میں کاشتکاری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ کارلائل نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسہ اور ان اسکول میں حاصل کی اور ۱۸۰۹ء میں اڈنبرا یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ یہاں اُس نے ۱۸۱۴ء تک تعلیم پائی اور ڈگری حاصل کئے بغیر کالج چھوڑ دیا۔ اس کے بعد دو سال تک وہ مذہبی تعلیم پاتا رہا لیکن اسے بھی نامکمل حالتمیں چھوڑ کر ایک مدرسہ میں ملازم ہو گیا۔ تین سال تک وہ یہاں نائب مدرس کی حیثیت سے کام کرتا رہا آخر اس سے تنگ آکر استعفا دیدیا اور اڈنبرا جاکر قانون پڑھنے لگا لیکن اسکی بیچین طبیعت کو اسمیں بھی کچھ دلچسپی نہ ہوئی اور آخر کار اُسے چھوڑ کر تالیف و تصنیف کا مشغلہ اختیار کیا۔

کارلائل کی زندگی پچیس سال تک تلوں مزاجیوں کا ایک مرقع رہی ہے جس سے

بظاہر اس کے ارادے کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے لیکن بنظر غور سے دیکھا جائے تو اسی تلون میں اسکی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ فطرت ہر انسان میں کسی نہ کسی کام کی خاص صلاحیت ودیعت کرتی ہے۔ اگر وہ اسیکی طرف متوجہ ہو اور اپنی فطری قابلیت کو بروئے کار لائے تو معراج کمال پر پہنچ سکتا ہے۔ لیکن زمانہ ہر شخص کی مساعدت نہیں کرتا اور وقتی ضرورتیں اُسے فطری رجحان کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کرتی ہیں یہی انسان کی آزمایش کا اصلی موقع ہے۔ اگر وہ سیلِ حوادث کی رو میں بہ گیا تو ایکدن بحرِ گمنامی میں غرق ہوجاتا ہے۔ اور اگر اُن کا مقابلہ کرکے کامیاب ہوگیا تو آسمان شہرت پر چمک جاتا ہے:۔

کارلائل کی تلون مزاجیوں میں اسی جد وجہد اور کشمکش کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ وقتی ضرورتوں سے مجبور ہوکر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتا ہے لیکن لیلیٰ مقصود سے دور نہیں ہونے پاتا کہ پھر اس کی طلب میں دوڑتا ہے ـــــ

افسوس! کتنے کارلائل اس خاکدان ہند میں دفن ہونگے جنھوں نے وقتی فوائد اور عارضی منافع کی خاطر اس آواز فطرت کی طرف سے بے اعتنائی کی اور اسکی پاداش میں ہمیشہ

کے لیئے آغوشِ گمنامی میں سلا دیئے گئے ۔

۱۸۳۷ء میں کارلائل نے "انقلاب فرانس" کے نام سے وہ بیش بہا تاریخ لکھی جو پہلے پہل اسکی شہرت کا باعث ہوئی اور ۱۸۴۱ء میں چند مشاہیر عالم پر وہ معرکۃ الآرا لکچر دیئے جو "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" (مشاہیر اور مشاہیر پرستی) کے عنوان سے شایع ہوئے اسکے بعد اسنے کرامول کے خطوط و خطبات اور فریڈرک اعظم کی سوانح عمری شایع کرائی جو اسکی آخری تصنیف ہے۔ کارلائل ان خوش نصیب اہل قلم میں سے ہے جنکی قدر انکی زندگی ہی میں کیگئی۔ ۱۸۶۵ء میں وہ اڈنبرا یونیورسٹی کا لارڈ رکٹر بنایا گیا اور ۱۸۷۴ء میں اسے پرشین آرڈر آف مرٹ کا اعزاز عطا ہوا غرضکہ ان عزت افزائیوں سے بہرہ اندوز ہونیکے بعد ۵ فروری ۱۸۸۱ء کو اس دار فانی سے چل بسا

کارلائل کا طرز تحریر نہایت دقیق اور پیچیدہ ہے، اسکا زور بیان اسکا ذخیرہ الفاظ اسکا جوش و خروش اور پرواز تخیل اس بلا کی ہے کہ انگلستان کے سے مردم خیز خطہ میں بھی اسکا ثانی نہیں ملتا وہ خیالات کا ایک بحر بے پایاں ہے جسکی تحدید و تحصیر ممکن نہیں، اس مختصر سے مضمون میں اسکی تحریر کے خصوصیات گنانا اور اسکی معجز نما انشا پردازی دکھانا ہمارے امکان سے باہر ہے، مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی ادب میں کارلائل کو وہی رتبہ حاصل ہے جو فارسی میں ابوالفضل و ظہوری کو یا عربی میں جاحظ اور حریری کو۔ مترجم

نوٹ:۔ اس کتاب میں جتنے فٹ نوٹ دیئے گئے ہیں ان سب کا ذمہ دار مترجم ہے۔

دوسرا لکچر

ہیرو پیغمبر کی حیثیت سے

محمدؐ - اسلام

جاہلیت کے اُس ابتدائی زمانہ سے جبکہ شمال میں اسکینڈی نیویا کے باشندوں پر شرک کی ظلمت طاری تھی ہم ایک بالکل جداگانہ مذہبی دور کیطرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو ان سے نہایت مختلف قوم پر گذر رہا تھا۔ یعنی عربوں پر اسلام کا عہد۔

اس طرح ہم انسان کے عالمگیر حالات اور خیالات میں ایک عظیم انقلاب اور ارتقاد سے دوچار ہوتے ہیں ؛

موجودہ ہیرو (محمدؐ) اپنے ابنائے جنس میں خدا نہیں مانا گیا[1] بلکہ ایسا انسان سمجھا گیا جسے خدا کے طرف سے وحی ہوئی یعنی پیغمبر۔

مشاہیر پرستی کی یہ دوسری صورت ہے۔ پہلی یا سب سے قدیم صورت اس طرح گزر گئی کہ اب اس کے واپس ہونے کی کوئی توقع نہیں۔ دنیا کی تاریخ میں پھر کوئی ایسا بڑا انسان نہ ہوگا جسے اس کے بنی نوع خدا سمجھیں۔ نہیں! بلکہ یہ ایک غور طلب سوال ہے کہ کیا کسی قوم نے کبھی فی الحقیقت ایسے شخص کو خدا مانا ہے جو اس کی نگاہوں کے سامنے موجود تھا؟ غالباً اس کا جواب نفی میں ملے گا۔ عموماً ایسے ہی انسان خدا مانے گئے ہیں جن کو لوگوں نے کبھی دیکھا تھا یا جن کی صرف یاد باقی رہ گئی تھی۔ لیکن آئندہ تو یہ بھی نہ ہوگا۔ اب کوئی بڑا انسان خدا نہیں مانا جاتا۔

کسی بڑے انسان کو خدا سمجھ لینا لوگوں کی نہایت فاش اور ابلہانہ غلطی تھی۔ اس کے باوجود ہمیشہ یہ مشکل سوال رہا ہے کہ دراصل اسے کیا سمجھنا چاہئے۔ اور کس طرح اس کا خیر مقدم

---

[1] یہ اشارہ اس طرف ہے کہ اس سلسلہ کے پہلے لکچر کا ہیرو (اوڈن) خدا مانا گیا تھا۔

کرنا چاہئے کسی عہد کی تاریخ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں نے کسی جلیل القدر انسان کا استقبال کس طرح کیا۔ لوگوں کو ہمیشہ ایسے انسان میں صفاتِ ایزدی کا کچھ نہ کچھ پرتو نظر آیا ہے۔ یہ نہایت اہم سوال ہے کہ لوگ ایسے شخص کو خدا سمجھتے ہیں یا پیغمبر یا کچھ اور اس کا جواب بمنزل ایک روزن کے ہے، جس میں سے ہم ان لوگوں کی روحانی حالت کی تہہ تک دیکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ تمام بڑے انسان دست قدرت سے نکلتے وقت درحقیقت یکساں ہوتے ہیں۔ اوڈن[۱]۔ لوتھر[۲]۔ جانسن[۳] اور برنس[۴] میری رائے میں دراصل ایک ہی جوہر سے

اوڈن[۱] قدیم توتانیون (جرمن اسکینڈی نیویا اور اینگلو سیکسن اقوام کا مجموعہ سٹیوٹن کہلاتا ہے، جس کا ترجمہ ہم نے توتانی کیا ہے) کا سب سے بڑا خدا مانا جاتا تھا۔

مارٹن لوتھر[۲] جرمنی کا مشہور مذہبی مصلح اور فرقہ پراٹسٹنٹ کا سب سے بڑا پیشوا ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۴۶ء میں وفات پائی۔

سیمول جانسن[۳] (ولادت ۱۷۰۹ء وفات ۱۷۸۴ء) انگریزی کا مشہور ادیب جسنے آکسفورڈ میں تعلیم پائی اور ۱۷۴۷ء میں انگریزی زبان کی نئی ڈکشنری ترتیب دی اس کا ابتدائی زمانہ بہت عسرت

ہیں لیکن جس طرح دنیا ان کا خیر مقدم کرتی ہے اور جو صورتیں وہ اختیار کرتے ہیں انہی کی وجہ سے ان میں بعد المشرقین ہو جاتا ہے، اوڈن کی پرستش ہم کو متحیر کر دیتی ہے یعنی لوگوں کا فرط حیرت و محبت سے ایک بڑے انسان کو سجدہ کرنا اور تہ دل سے یہ سمجھنا کہ وہ عرش کا مکین یعنے خدا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان کی یہ تعظیم ناقص تھی لیکن جس طرح ہم نے برنس سے انسان کا خیر مقدم کیا کیا وہ کامل کہا جا سکتا ہے؟ انتہائی قیمتی تحفہ جو قدرت اس دنیا کو عطا کر سکتی ہے۔ اور جسے ہم غیر معمولی انسان کہتے ہیں (ایک ایسی انسانی روح جو آسمان سے خدا کا پیغام دیکر ہمارے پاس بھیجی گئی) ہم اس کو معمولی اور

میں گزرا لیکن ادبی خدمات کے صلہ میں اسے ۱۷۶۲ء میں تین سو پونڈ سالانہ کا شاہی وظیفہ عطا ہوا اس کے ایک دوست باز ول نے اس کی سوانح عمری لکھی جو انگریزی زبان میں بہت مشہور ہے۔

(۲) رابرٹ برنس (۱۷۵۹ء سے ۱۷۹۶ء) انگریزی زبان کا نہایت ممتاز شاعر جو اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ اس کے کلام کا پہلا مجموعہ ۱۷۸۶ء میں شائع ہوا۔ کثرت شراب خواری اور عیاشی کی وجہ سے کم عمری میں لقمۂ اجل ہو گیا۔

مصنوعی آتشبازی کی طرح رائگاں کر دیتے ہیں جو ہمیں تھوڑی دیر تک محظوظ کر کے خاکستر بن جانے کے لئے بھیجی گئی ہو۔ ایک جلیل القدر انسان کے ایسے خیر مقدم کو بھی میں کامل نہیں قرار دے سکتا۔

اس مسئلہ پر کامل غور کرنے کے بعد غالباً ہر شخص آخر الذکر صورت کو زیادہ مذموم ٹھیرائے گا، جو انسانی خصائل کی اُس سے زیادہ افسوس ناک کمزوریوں کا اظہار کرتی ہے۔ جن کا ثبوت ہم کو باشندگان اسکینڈی نیویا کی پرستش سے ملتا ہے، محبت و تعریف کی بے جا افراط اچھی نہیں ہوتی لیکن ازراہ نخوت بجا محبت کا فقدان اس سے بھی بدتر ہے۔ مشاہیر پرستی کی صورت ہمیشہ بدلتی رہی ہے۔ یہ صورت اگرچہ ہر عہد میں مختلف رہی لیکن کبھی مکمل نہ ہوئی گو ہر زمانہ کا میلان اسکی تکمیل کی طرف رہا ہے۔

ہم نے حضرت محمدؐ کا انتخاب اس وجہ سے نہیں کیا کہ آپ افضل ترین پیغمبر ہیں بلکہ اس لئے کیا ہے کہ ہم آپ کے متعلق آزادی کے ساتھ اظہار خیال کر سکتے ہیں، آپ صادق ترین پیغمبر نہیں لیکن میرے خیال میں پیغمبر صادق ضرور ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ ہم میں سے کسی کے مسلمان ہو جانے کا اندیشہ نہیں اس لئے ہم

آپ کے وہ تمام اوصاف بیان کر دینا چاہتا ہوں جو انصاف کے ساتھ ممکن ہیں
آپ کے تعلیمات سمجھنے کے لئے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ آپ کے ذہن میں دنیا کا
کیا تصور تھا۔ اس کے بعد ہم اس کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں گے کہ اہل دنیا
آپ کو کیا سمجھتے تھے، حضرت محمدؐ کے متعلق ہمارا موجودہ یہ قیاس بالکل بے بنیاد
ہے کہ آپ دغاباز اور کذب مجسم تھے اور آپ کا مذہب محض فریب و نادانی کا ایک
مجموعہ ہے" کذب و افترا کا وہ انبار عظیم جو ہم نے اپنے مذہب کی حمایت میں اس
ہستی کے خلاف کھڑا کیا خود ہمارے لئے شرمناک ہے جب پوکاک[1] نے گروٹی[2] سے

---

[1] اڈورڈ پوکاک (سنہ ۱۶۰۴ء سنہ ۱۶۹۱ء) انگریز مستشرق اور انجیل کا عالم ایک پادری کا بیٹا تھا
وہ اپنے انہی تصانیف کی وجہ سے مشہور ہے جو عرب کے موضوع پر لکھے گئے تھے۔ لندن کے بشپ
اور اکسفورڈ یونیورسٹی کے چانسلر ولیم لاڈ نے سنہ ۱۶۳۲ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے لئے عربی کی پروفیسری
کا ایک عہدہ قائم کر کے اس پر پوکاک کا تقرر کیا تھا۔

[2] ہیوگروٹی س (سنہ ۱۵۸۳ء سنہ ۱۶۴۵ء) ڈچ ماہر سیاسیات و دینیات اور مقنن دنیا کا

پوچھا کہ "ہمارے پاس اس قصہ کے متعلق کیا ثبوت ہے کہ محمدؐ نے ایک کبوتر سدھا رکھا تھا جو اکران کے کانوں سے مٹر کے دانے چنا کرتا اور جسے وہ کہتے کہ فرشتہ وحی لایا ہے" تو گروٹی میں نے جواب دیا کہ "اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے"۔ اب دراصل وہ وقت آ پہنچا ہے کہ اس قسم کی مہمل باتیں چھوڑ دی جائیں۔ اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ آج بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ انسانوں کے حق میں شمع ہدایت کا کام دے رہے ہیں۔ یہ اٹھارہ کروڑ انسان بھی ہماری طرح خدا تعالیٰ کے دست قدرت کا نمونہ تھے، بندگانِ خدا کی بیشتر تعداد آج بھی کسی اور شخص کے بہ نسبت محمدؐ کے اقوال پر اعتماد رکھتی ہے، کیا ہم کسی طرح اسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ سب روحانی بازیگری کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا جس پر اتنے بندگانِ خدا ایمان لائے اور گزر گئے؟ اپنی حد تک تو میں ایسا قیاس نہیں قائم کر سکتا۔ اسے ماننے سے پہلے میں بہت سی بعید از قیاس باتوں کو تسلیم کر لوں گا۔ اگر اس دنیا میں مکر و فریب اس قدر

نہایت ذہین آدمی سمجھا جاتا ہے جس نے بہت کم عمری میں انتہائی غیر معمولی قابلیت حاصل کر لی تھی۔

فروغ پا سکتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی دنیا کے متعلق کیا رائے قائم کیجائے؟

افسوس! ایسے نظرئے سخت افسوس ناک ہیں۔ اگر ہم کائنات کی کسی چیز کے متعلق صحیح علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایسے نظریوں کو قطعاً غلط سمجھنا چاہیئے، یہ نظرئے عہد ارتیاب کی پیداوار ہیں۔ جو سخت ترین روحانی جمود کو ظاہر کرتے ہیں اور جن سے ارواح انسانی کی موت کا پتہ چلتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑھکر ملحدانہ نظریہ اس دنیا میں آج تک نہ قائم کیا گیا ہوگا۔ ایک جھوٹا آدمی اور کسی مذہب کا بانی ہو! جھوٹا آدمی اینٹ اور چونے کا ایک مکان تو بنا نہیں سکتا۔ اگر کسی شخص کو مٹی، چونے اور اُن اشیاء کے خواص کا صحیح علم نہو اور وہ ان کا پورا لحاظ نہ رکھے جو مکان کی تعمیر میں استعمال ہوتے ہیں تو اس کا بنایا ہوا مکان مکان نہ کہلا سکیگا بلکہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا۔ ایسا مکان بارہ صدی تک نہیں قائم رہ سکتا اور نہ اس میں اٹھارہ کروڑ انسان سما سکتے ہیں۔ وہ تو فوراً گر جائیگا۔

انسان کو قوانین قدرت کے مطابق عمل کرنا اور اشیاء کی حقیقت و ماہیت سے بخوبی آگاہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ قدرت اس کا ہرگز ساتھ نہ دیگی

کاغذ کی ناؤ کبھی چل نہیں سکتی۔ کیگ لی اوسٹرو[1] کی طرح کے بہت سے انسان دنیا کے قائد اعظم بنجاتے ہیں۔ اور اپنی فریب کاریوں کی بدولت دو دن کیلئے فروغ پا جاتے ہیں۔ لیکن ان کی مثال جعلی نوٹ کی ہے جس کو وہ تو بھنا لیتے ہیں۔ مگر خمیازہ دوسروں کو بھگتنا پڑتا ہے، قدرت انقلاب فرانس اور اسی قسم کے اور واقعات کی صورت میں بھڑک اٹھتی ہے۔ اور انتہائے صداقت کے ساتھ جعلی نوٹوں کو جعلی ثابت کر دکھاتی ہے:۔

لیکن ایک بڑے انسان کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سچا ہوتا ہے، میرے نزدیک صداقت اُس کی بنائے اساسی ہے۔

---

[1] کیگ لی اوسٹرو کاؤنٹ (۱۷۴۳ء تا ۱۷۹۵ء) اطالوی نژاد کیمیاگر تھا جو مدت دراز تک یورپ کے مختلف ممالک سے دغا و فریب کے ذریعہ روپیہ وصول کرتا رہا۔ اس نے طرح طرح کی جھوٹی چیزیں بنائیں اور مختلف الزاموں کی پاداش میں فرانس اور انگلستان میں سزایاب ہوا آخر ۱۷۸۹ء میں اس کے لیئے روما میں سزائے موت تجویز کی گئی جو بعد میں حبس دوام سے بدل دی گئی۔

مرابو[۱]، نپولین[۲]۔ برنس[۳] کرامول[۴] غرض جس شخص نے دنیا میں کچھ کیا ہے اُس نے پہلے خلوص نیت کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ اور ایسے ہی آدمی کو میں "مخلص انسان" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں۔

میرا یہ خیال ہے کہ خلوص۔ بڑا۔ گہرا اور سچا خلوص ہر بڑے انسان کی پہلی خصوصیت ہے، ایسا خلوص نہیں جو آپ اپنی تعریف کرے۔ وہ تو بالکل بے کار ہے ایسا خلوص جو تنگ ظرف۔ خودستا اور خودبین ہوتا ہے، وہ عموماً غرور کی علامت ہے

---

[۱] مرابو فرانس کا مشہور مدبر ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۹۱ء میں وفات پائی۔ فرانس کی سیاسیات میں اس نے بہت بڑا حصہ لیا۔ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے ایک سے زیادہ موقعوں پر اپنی عزت و آبرو معرض خطر میں ڈالدی اور ایک عالم کو اپنا دشمن بنالیا۔

[۲] نپولین اول (بونا پارٹ) ۱۵ اگست ۱۷۶۹ء کو جزیرہ کورسیکا میں پیدا ہوا۔ ۱۷۸۹ء میں ایک معمولی عہدہ پر فوج میں ملازم ہوا۔ اور اپنی خداداد قابلیت سے یہاں تک ترقی کی کہ ۱۷۹۹ء میں فسٹ کونسل کے نام سے فرانس کا صدر ہوگیا۔ اور ۱۸۰۴ء میں نپولین اول شہنشاہ فرانس

جلیل القدر انسان کا خلوص اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ اس کا اظہار بلکہ احساس تک نہیں کرسکتا۔ نہیں! بلکہ میرے خیال میں اسے اپنی نارسائی کا اعتراف ہوتا ہے کیونکہ کون ایسا شخص ہے جو ایک دن کے لئے بھی قانون صداقت پر پوری طرح عمل کر سکے۔ اس لئے کوئی بڑا انسان اپنی صداقت کا دعویٰ کرنا درکنار اس کا تصور تک دل میں نہیں لاتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ صداقت اس کے اختیاری نہیں ہوتی یعنے اُسے صادق ہوئے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ اس کی نگاہوں میں زندگی کی حقیقت کبریٰ

کے لقب سے مملکت فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ اس کے غیر معمولی فتوحات اور فوق العادہ کارنامے اگر تفصیل سے بیان کئے جائیں تو غالباً اس کے لئے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی۔ آخر ۱۸۱۵ء میں ڈیوک آف ونگٹن نے اسے جنگ واٹرلو میں شکست دی اور وہ سینٹ ہلینا میں قید کر دیا گیا جہاں ۱۸۲۱ء میں یہ فاتح اعظم ناز اجل ہو گیا۔

ملاحظہ ہو فٹ نوٹ صفحہ (۴)

اُلیور کرامول (۱۵۹۹ء تا ۱۶۵۸ء) انگلستان کا مایۂ ناز مدبر جس نے کرنل کی حیثیت سے بہت فوجی خدمات اور مدبر کی حیثیت سے ملک کے بہت سے سیاسی خدمات انجام دئیے۔

بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ہر چند کوشش کرے لیکن اس حقیقت کے مہیب احساس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ یہ بات اس کی فطرت میں داخل ہوتی ہے۔ اور یہی سب سے بڑھکر اس کی عظمت کا باعث ہے۔ اس کے نزدیک یہ کائنات خوف و استعجاب سے بھلوا اور موت و حیات کی طرح حقیقی ہے۔ دنیا کے تمام انسان اس حقیقت کو بھول جائیں۔ اور نمود و نمایش کرتے پھریں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کی نگاہوں میں ہر وقت حقیقت کا شعلۂ آتشین دہکتا رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے بخوبی سمجھ جائیں کہ میرے نزدیک بڑے انسان کی یہ پہلی تعریف ہے۔ یہ خصوصیات کسی معمولی انسان میں بھی ہو سکتے ہیں۔ تمام بندگان خدا کے لئے ان کا وجود ممکن ہے لیکن ایک بڑے انسان کے لئے ان کا وجود لازمی ہے

ایسے ہی شخص کو ہم "اوریجنل انسان" کہتے ہیں اس کی فطرت کسی پہلے مرقع کی نقل نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسا قاصد ہے جو پردۂ ازل سے پیغام دے کر ہمارے پاس بھیجا گیا۔ خواہ ہم اسے شاعر کہیں یا پیغمبر یا خدا بہر صورت ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ساری نوع انسان کے الفاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔

وہ حقیقت اشیاء کی روح رواں سے نکلتا ہے۔ اور رات دن اُسی میں بسر کرتا ہے
اوہام اُس سے اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتے۔ وہ اندھا ہو، بے خانماں ہو۔
مصیبت زدہ ہو۔ روزمرہ کی گفتگو میں منہمک ہو لیکن یہ حقیقت روز روشن کی طرح
ہر وقت اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ کیا اس کے الفاظ فی الحقیقت ایک طرح کی
وحی نہیں ہیں؟ جب اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی اور لفظ ہی
نہو تو پھر ہم وحی کے سوا اُسے کس نام سے تعبیر کریں! ایسے انسان کی ہستی قلب
کائنات سے اُبھرتی ہے اور وہ اشیاء کی بنیادی حقیقت کا ایک جزو ہوتا ہے۔
خدا تعالیٰ نے اس دنیا میں بہت سے الہام بھیجے ہیں۔ لیکن کیا یہ شخص اس کا آخری
اور تازہ ترین مظہر نہیں ہے! اُس کی عقل وحی کی پروردہ ہوتی ہے" اس لئے سب کو
چھوڑ کر ہمیں اس شخص کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

ہم کسی طرح حضرت محمدؐ کو حریص و منصوبہ باز اور ان کے تعلیمات کو جہل و
نادانی نہیں سمجھ سکتے وہ اُمیانہ پیغام جو آپ لیکر آئے تھے بالکل سچا تھا۔ وہ ایک
آوازِ پریشان تھی جو پردۂ غیب سے بلند ہوئی۔ اس شخص کے نہ اقوال جھوٹے تھے

نہ افعال سے اُس میں تنگ ظرفی اور نمائش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ زندگی کا ایک جلوۂ تاباں تھا۔ جو خاص سینۂ فطرت سے ہویدا ہوا۔ اور جسے خالق عالم نے کائنات کو منور کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ محمد کی لغزشیں۔ کمزوریاں حتیٰ کہ اُن کی ریاکاریاں بھی (اگر وہ کبھی ثابت ہو بھی جائیں) اُن کے متعلق اس بنیادی حقیقت کو متزلزل نہیں کر سکتیں ؛

ہم عام طور پر لغزشوں کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں جن کے فروع کا انبار اصل حقیقت کو چھپا دیتا ہے۔ لغزش سے کیا مراد؟ میری رائے میں عظیم ترین لغزش احساس معصومیت کا نام ہے انجیل کا مطالعہ کرنے والے اس رمز کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ انجیل میں "خدا کے برگزیدہ بندہ" کا خطاب کسے دیا گیا ہے؟ اسرائیلی بادشاہ داؤد کو جن سے بدترین گناہ سرزد ہو چکے تھے۔ اور جن کی زندگی میں گناہوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ اسی بنا پر غیر مذاہب کے پیرو ہم سے حقارت سے پوچھتے ہیں کہ "کیا آپ کے نزدیک یہی خدا کے برگزیدہ بندہ ہیں"؟ لیکن میرے نزدیک ان کی یہ حقارت کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ لغزش کسے کہتے ہیں؟

اور زندگی کے خارجی فروع کی کیا حقیقت ہے۔ اگر اس کے اندرونی اسرار یعنی انفعال واشتعال (گو وہ اکثر متزلزل ہوگئے ہوں) اور ان کی لامتناہی کشمکش نظر انداز کردی جائے۔ وہ قوت جو انسان کو راہ راست پر چلاتی ہے اس کے اختیاری نہیں کیا صفاتِ انسانی میں "ندامت" سب سے زیادہ ملکوتی صفت نہیں ہے؟ میرے نزدیک بدترین گناہ اسی متکبرانہ احساس بیگانہ ہی کا نام ہے۔ جو دراصل ایک طرح کی روحانی موت ہے۔ ایسا قلب خود بین اخلاص۔ عجز اور حقیقت شناسی سے معرا ہوگا وہ ایک جسد بے روح ہے۔ جو خالص تو ہے مگر ایسا خالص جیسے کہ خشک ریت خالص ہوتی ہے حضرت داؤدؑ کے حالاتِ زندگی جو زبور میں بیان کئے گئے میرے نزدیک اس دنیا میں ایک انسان کے اخلاقی ارتقاء اور جد وجہد کا بہترین نمونہ ہیں۔ اربابِ نظر کو ان واقعات میں ایک سرگرم انسانی روح درجۂ کمال پر پہنچنے کے لئے مسلسل کشمکش کرتی دکھائی دیگی۔ ایسی کشمکش جو بارہا راہ راست سے بھٹک گئی۔ ایسی بھٹکی کہ قعرِ ہلاکت تک پہنچ گئی۔ لیکن کبھی ختم نہ ہوئی

بلکہ ہمیشہ اشکِ ندامت اور ارادۂ مستقل کے ساتھ از سرِ نو شروع ہوئی۔ اے بیکس فطرتِ انسانی! کیا انسان کی رفتار درحقیقت پیہم لغزشوں سے عبارت نہیں ہے؟ اس سے زیادہ اُس کے بس میں کیا ہے کہ وہ زندگی کے اس سخت عنصر میں جہد پیہم کرتا رہے۔ قعرِ مذلت میں گرے اور پھر اٹھکر بادیدۂ گریاں یا سینۂ بریاں آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اُس کی طلب صادق اور کشاکش لامتناہی ہو۔ اگر اصل صداقت پر مبنی ہوئی تو ہم اس کے بہت سے فروع سے قطع نظر کرسکتے ہیں لیکن فروع کبھی ہماری رہنمائی اصل کی طرف نہیں کرسکتے، مجھے یقین ہے کہ اگر محمدؐ کی لغزشیں مان بھی لی جائیں تو ہم ان کا اندازہ کرنے میں سخت غلطی کررہے ہیں۔ اور اس میں الجھے رہنے سے ہم کبھی انکے رموز کی تہ تک نہ پہنچ سکیں گے۔ اس لئے اب ہم اس تمام بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اور یہ یقین کرکے کہ فی الحقیقت آپ ایک سچا پیغام لے کر آئے تھے، معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا تھا؟

عرب جس میں حضرت محمدؐ کی ولادت ہوئی تھی اپنے خصوصیات کے اعتبار سے ایک غیر معمولی قوم ہے۔ اس کا ملک خود ایک غیر معمولی حیثیت رکھتا ہے جو ایسی قوم کے شایاں ہے۔ ننگی چٹانوں کے ناقابل گذر پہاڑ بڑے بڑے مہیب ریگستان جن میں خال خال سبزہ دکھائی دیتا ہے جہاں کہیں پانی ہے وہاں سبزہ۔ حسن۔ خوشبودار مہندی کے درخت نخلستان اور لوبان کے درخت ملتے ہیں۔ ذرا اُس لق ودق ریگستان کا تصور کیجئے جہاں ہر طرف ریت ہی ریت نظر آتی ہے۔ اور جہاں ہر وقت سکون مطلق طاری رہتا ہے ایسے ریگستان مختلف آبادیوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں جہاں انسان کائنات میں اپنے کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہے۔ دن کے وقت آفتاب کی ناقابل برداشت حرارت آتش فشانی کرتی رہتی ہے۔ اور رات کو چرخ نیلوفری پر تارے چھٹکے نظر آتے ہیں۔ ایسا ملک ایسی ہی قوم کے شایاں ہے جس کے افراد جسم کے پھرتیلے اور طبیعت کے گھرے ہوں۔ عربوں کی فطرت میں حد درجہ مستعدی اور چالاکی کے باوجود نہایت غور وفکر اور جوش وسرگرمی

پائی جاتی ہے۔ ایرانی "مشرقی فرانسیسی" کہلاتے ہیں۔ ہم عربوں کو "مشرقی اطالویوں" کے نام سے یاد کریں گے۔ ان کی فطرت عالی ہے۔ اُن کے جذبات اگرچہ نہایت تند و تیز ہوتے ہیں لیکن ان پر انہیں بلا کا قابو حاصل ہے، جو شرافت نفس اور فطرتِ عالی کی دلیل ہے۔ ایک وحشی بدو ایک اجنبی کا اس طرح خیر مقدم کرتا ہے گویا وہ اُس کے خیمہ کی ساری املاک کا حقدار ہے۔ یہ اجنبی خواہ اس کا کیسا ہی سخت دشمن ہو لیکن وہ اُس کی ضیافت کے لئے اپنے جانور ذبح کریگا اور تین دن تک اُس کی خاطر تواضع کو اپنا مقدس ترین فرض سمجھے گا۔ اس کے بعد اُسے رخصت کریگا۔ لیکن رخصت کرنے کے بعد اگر اُس کا بس چلے تو ایک دوسرے قانون کی اتباع میں جسے وہ ایسا ہی مقدس سمجھتا ہے اس کے قتل سے بھی دریغ نہ کریگا۔ جو حال عربوں کے افعال کا ہے وہی ان کے اقوال کا۔ یہ لوگ باتونی نہیں ہوتے بلکہ کم سخن ہوتے ہیں۔ لیکن جب بولنے پر آتے ہیں۔ تو فصاحت کے دریا بہاتے ہیں۔ غرض یہ مخلص اور راستباز ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آپ لوگوں کو

معلوم ہے نسل کے اعتبار سے ان کا تعلق یہودیوں سے ہے۔ لیکن یہودیوں کی مکروہ اور شدید سنجیدگی کے ساتھ ان میں ایک عجیب طرح کی خوش ادائی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ جو یہودیوں میں نہیں ہوتی۔ طلوع اسلام سے قبل ان میں مشاعرے ہوا کرتے تھے، سیل[1] لکھتا ہے کہ "جنوبی عرب کے بازار عکاظ میں سالانہ میلے لگا کرتے تھے۔ جہاں مال تجارت کی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ شاعر حصول انعام کے لئے نظمیں پڑھا کرتے اور لوگ انہیں سننے کے لئے جمع ہوتے تھے"۔

یہودیوں کی ایک خاص صفت جو ان عربوں میں پائی جاتی ہے اور

---

[1] جارج سیل (سنہ ۱۶۸۰ء تا سنہ ۱۷۳۶ء) ممتاز انگریز مستشرق لندن کے ایک تاجر کا لڑکا تھا کچھ عرصہ تک یہ سالیسٹر کی حیثیت سے پریکٹس کرتا رہا۔ اس کے بعد انجیل کے عربی ترجمہ کی تصحیح کا کام اس کے سپرد ہوا۔ اس نے بہت سے مشرقی مشاہیر پر جنرل ڈکشنری میں آرٹیکل لکھے ہیں۔ اس کا انگریزی ترجمۂ قرآن بہت مشہور ہے جو سنہ ۱۷۳۴ء میں شایع ہوا۔

جسے تمام اعلیٰ صفات کا حاصل کہنا چاہئے۔ ان کی مذہبیت ہے، زمانہ قدیم سے وہ اپنے اعتقاد کے مطابق سخت مذہب پرست رہے ہیں۔ انھوں نے صابئین کی طرح نجم پرستی کی۔ بہت سے قدرتی اشیاء کو پوجتے رہے اور ان کو مظہر ربانی اور جلوہ یزدانی قرار دیا۔ یہ اُن کی غلطی تھی۔ لیکن ہم اسے پوری طرح غلط بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ دستِ قدرت کی تمام صنعتیں ایک معنی کر کے مظہر ربانی ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا کیا ہم اب بھی تمام قدرتی اشیاء کی عظمت تسلیم کرنے کو ایک بڑا وصف نہیں سمجھتے۔ اور اسے "شاعرانہ حسن" سے تعبیر نہیں کرتے؟

اگر کوئی شخص شاعر ہو تو اس کی عزت کی جاتی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ شعر کہتا یا شعر گاتا ہے۔ اس عزت و حرمت میں بھی پرستش کی ایک ہلکی سی جھلک موجود ہے۔ غرض یہ کہ عربوں میں بہت سے مذہبی پیشوا گزرے ہیں جو اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق اپنے قبیلہ کو تعلیم دیتے تھے۔

ان غیر متمدن لوگوں کے سینہ میں زہد و اتقا اور شرافت نفس کے

جو جذبات موجزن تھے۔ ان کا بہترین اور بیّن ثبوت زمانہ قدیم سے لے کر
اب تک ہمیں ایک ایسی چیز سے ملتا ہے۔ جو مرئی اور محسوس ہے انجیل کے نقاد
اس پر متفق ہیں کہ خود ہماری "کتاب ایوب" اسی خطۂ زمین میں لکھی گئی تھی
اس کتاب کے متعلق جتنے نظریے قائم ہوئے ان سب سے قطع نظر کر کے میں
اسے زورِ قلم کا بہترین کارنامہ سمجھتا ہوں۔ اس میں فرقہ بندی یا حب الوطنی کے
برخلاف ایسی اعلیٰ وسعت و ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے گویا یہ
عبرانی کتاب نہیں۔ یہ بلند پایہ کتاب ساری نوع انسان کے لئے ہے۔ یہ قسمت
انسانی اور فطرت الٰہی کے عقدۂ لاینحل کے متعلق ہماری پہلی اور قدیم ترین دستاویز
ہے جس کا طرز بیان نہایت صاف اور دلاویز ہے۔ اُس کی سادگی۔ اُس
کی سچائی۔ اُس کا نرم اور اُس کی لطافت بیان میں نہیں آسکتی۔ اُس میں
دیدۂ بینا اور عقل رسا کے ایسے آثار پائے جاتے ہیں جن میں روحانی اور مادی
ہر قسم کی چیزوں کے لئے صحیح نگاہ اور بصیرت موجود ہے۔ اس کے اچھوتے
تشبیہات اور استعارات کی نظیر نہیں ملتی۔

اس ساز کہن میں شادی و غم کے وہ نغمہائے شیریں پنہاں ہیں
جو قلب انسانی میں موج دریا اور چادر مہتاب کے سے رنگین جلوے پیدا
کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادبی لطافتوں کے اس نظر فریب مرقع کا جواب
نہ بائبل میں ملسکتا ہے نہ کہیں اور ؛

بت پرست عربوں کے ہاں منجملہ اور قدیم ترین اشیاء پرستش کے
ایک حجرالاسود تھا جو اب بھی بمقام مکہ اس عمارت میں رکھا ہے جو کعبہ کے
نام سے موسوم ہے۔ ڈیوڈورس[1] سی کیولس صاف و صریح طور پر کعبہ کو اپنے عہد
(یعنی تقریباً پچاس سال قبل مسیح) کی قدیم ترین اور مقدس ترین عبادت گاہ
بیان کرتا ہے۔ سلوستر[2] دی ساسی لکھتا ہے کہ "بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے

---

[1] ڈیوڈورس سی کیولس پہلی صدی عیسوی کا یونانی مورخ جزیرہ سسلی میں پیدا ہوا۔ اس نے
ایک مبسوط تاریخ لکھی ہے جس میں گیارہ سو اڑتالیس سال کے واقعات جمع کئے ہیں۔

[2] سلوستر دی ساسی فرانسیسی مستشرق ۱۷۵۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۸ء میں وفات پائی۔

کہ حجر الاسود آسمانی پتھر ہے"۔

ایسی صورت میں کیا عجب ہے کہ کسی شخص نے اسے آسمان سے گرتے ہوئے بھی دیکھا ہو۔ اب یہ پتھر چاہ زمزم کے قریب رکھا ہے اور کعبہ ان دونوں کے اوپر تعمیر[1] کیا گیا ہے۔ کنواں جس میں سخت زمین سے سیل زندگی کی طرح پانی ابل رہا ہو ہر جگہ خوشنما اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً گرم ممالک میں جہاں وہ زندگی کی شرط اول ہے۔ چاہِ زمزم کی وجہ تسمیہ پانی جھرنے کی آواز ہے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی کنواں ہے جسے ہاجرہ نے اسمٰعیل کے ساتھ جنگل میں دیکھا تھا غرض حجر الاسود اور یہ کنواں اب بھی مقدس سمجھا جاتا ہے جس پر ہزارہا سال سے کعبہ قائم ہے۔

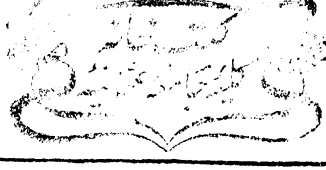

---

[1] چونکہ حدود حرم میں عیسائی بآسانی نہیں پہنچ سکتے اس لیے یورپین مورخین وہاں کے حالات میں اکثر غلطی کرتے ہیں کہ کعبہ حجر الاسود اور چاہ زمزم کے اوپر تعمیر نہیں کیا گیا بلکہ یہ ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلہ پر علیحدہ علیحدہ واقع ہیں۔

یہ کعبہ ایک عجیب چیز ہے۔ اس وقت بھی وہ سیاہ غلاف اوڑھے کھڑا ہے۔ جو خلفا ہر سال اس کے لئے بھیجتے ہیں اُس کی بلندی ستائیس ہاتھ ہے۔ اور اس کے اطراف ستونوں کے دو حلقے ہیں۔ یہ جگہ جھاڑ و فانوس اور نادر سامانِ آرائش سے سجائی گئی ہے۔ یہ فانوس آج رات کو بھی روشن کئے جائیں گے اور تاروں بھرے آسمان کے نیچے جگمگائیں گے۔ غرض یہ قدیم ترین عہد کی ایک معتبر یادگار ہے، یہ تمام مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ جس کی طرف دہلی سے لیکر مراکو تک کے بے شمار نمازیوں کی نگاہیں روزانہ پانچ مرتبہ پلٹتی ہیں۔ بلاشبہ چار دانگ عالم کا یہ مقدس ترین مرکز ہے۔ تمام قبائل عرب اس حجر الاسود اور چاہ زمزم کی زیارت کو آتے تھے، اور اسی تقدس کی وجہ سے مکہ کو ایک شہر کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، کسی زمانہ میں مکہ بہت بڑا شہر تھا مگر اب بہت ویران ہوگیا ہے کیونکہ اس میں شہر بننے کی قدرتی صلاحیت نہیں۔ وہ سمندر سے دور تنگی پہاڑیوں کے درمیان ریتیلے نشیب میں واقع ہے۔ جہاں غلہ تک

باہر سے آتا ہے لیکن وہاں اکثر زائرین کو مکان کی ضرورت تھی۔ پھر یہ قاعدہ کی بات ہے کہ تمام مقامات زیارت ہمیشہ تجارتی مرکز بھی بنجایا کرتے ہیں۔ ادھر زائرین جمع ہوئے کہ ساتھ ہی تاجر بھی پہنچے۔ جہاں لوگ ایک ضرورت سے جمع ہوتے ہیں۔ وہاں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی اور ضرورتیں بھی پوری کر سکتے ہیں۔ جو مجمع کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ مکہ سارے عرب کا مرکز بن گیا۔ اور اس طرح اُسے ہندوستانی اور مغربی ممالک (شام، مصر اور اٹلی) کے درمیان سب سے بڑی تجارتی منڈی کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ کسی زمانہ میں مکہ کی آبادی ایک لاکھ تھی جو مشرقی اور مغربی پیداوار کا لین دین کرتی اور جلب منفعت کے لئے غلہ اور دیگر اشیائے خورد و نوش بہم پہنچاتی۔ وہاں کی حکومت ایک طرح کی بے قاعدہ اعیانی جمہوریت تھی جس میں مذہبیت کی جھلک پائی جاتی۔

کسی بڑے قبیلہ کے دس آدمی بے قاعدہ طور پر منتخب کر لئے جاتے اور مکہ کی حکومت اور کعبہ کی تولیت اُن کے سپرد کر دی جاتی۔ آنحضرتؐ

کے زمانہ میں قریش کا قبیلہ سب میں ممتاز تھا۔ اور آپ کا خاندان اسی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ باقی قوم جس کو ریگستانوں نے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اسی قسم کی غیر منظم حکومت کے ماتحت تھی جس کی عنان ایک یا زیادہ شیخ قبیلہ کے ہاتھوں میں ہوتی۔ قوم کے افراد میں۔ گلہ بان، مزدور، تاجر، ڈاکو غرض سب ہی شامل تھے۔ جو اکثر ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے اور جن میں کوئی باہمی شیرازہ بندی بجز اُس اجتماع کے نہ تھی۔ جو کعبہ میں ہوا کرتا۔ یہاں زبان اور نسل کی قدرتی اور ناقابلِ تفریق یکسانیت عرب پرستی کی مختلف صورتوں کو لا کر ایک مرکز پرستش پر جمع کر دیتی۔ اس حالت میں عرب اپنی بہت سی خوبیوں کے ساتھ مدت دراز سے دنیا کی نگاہوں سے چھپے ہوئے انجان طور پر اُس موقع کے منتظر تھے۔ جو انہیں سارے عالم سے روشناس کرا دے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی بت پرستی تنزل ہو چکی تھی۔ اور ان کی حالت میں ابتری اور انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ دنیا کے اہم ترین واقعہ یعنے حضرت مسیحؑ کی ولادت

اور وفات کی (جس نے دنیا کی تمام قوموں میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا) اڑتی اڑتی خبریں چند صدیوں میں عرب میں بھی پہنچیں۔ اور ایک ہیجان پیدا کر دیا۔

عربوں کی یہ حالت تھی کہ ۵۷۰ء میں حضرت محمدؐ ان میں پیدا ہوئے جیسا کہ اوپر بیان ہوا آپ کا تعلق قبیلہ قریش کے خاندان بنی ہاشم سے تھا۔ اور گو خود آپ غریب تھے۔ لیکن شہر کے اکثر معززین سے آپ کا رشتہ تھا۔ ولادت سے کچھ پہلے آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور ہنوز آپ چھ برس کے نہ ہوئے تھے کہ آپ کی والدہ بھی (جو اپنے حسن۔ قابلیت اور سمجھ کے اعتبار سے شہرت رکھتی تھیں) رحلت کر گئیں۔ اس طرح آپ کی پرورش آپ کے دادا (عبدالمطلب) کے تفویض ہوئی جن کی عمر اُس وقت سو برس کے قریب تھی۔ آنحضرتؐ کے والد حضرت عبداللہ عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے اور چہیتے بیٹے تھے۔ عبدالمطلب نے اپنی صد سالہ آنکھوں سے عبداللہ کی تصویر کو حضرت محمدؐ کے پیکر میں

جلوہ پیدا دیکھا اور اس یتیم سے بے انتہا محبت کرنے لگے۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ "اہل خاندان کو اس طفل صاحب جمال کی بڑی حفاظت کرنی چاہئے کیونکہ ان میں اب تک کوئی ایسا گوہر بے بہا نہیں پیدا ہوا"۔ لیکن دو سال بعد عبدالمطلب نے بھی وفات پائی۔ اور آپ کی تربیت ابوطالب کے سپرد ہوئی۔ جو آپ کے سب سے بڑے چچا اور سارے خاندان کے بزرگ تھے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالب نہایت منصف مزاج اور سمجھدار آدمی تھے۔ اور انھوں نے آنحضرتؐ کی تربیت بہترین عربی طریقہ پر کی۔

آنحضرتؐ نے سن شعور کو پہونچنے کے بعد اپنے چچا کے ساتھ تجارت اور دوسرے اغراض کے لئے مختلف سفر کئے اور اٹھارویں سال انہی کے ساتھ ایک جنگ[1] میں بھی شرکت فرمائی۔ لیکن آپ کا اہم ترین سفر وہ ہے

---

[1] یہ جنگ حرب فجار کے نام سے مشہور ہے۔

جو اس سے چند سال قبل شام کے میلوں میں شرکت کی غرض سے آپ نے اختیار کیا تھا۔ کیونکہ اس موقع پر پہلی دفعہ آپ کو بیرونی دنیا دیکھنے کا اتفاق ہوا اور آپ اُس عنصر جدید (یعنے مذہب عیسوی) سے واقف ہوئے جو آپ کے لئے بے انتہا اہم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اس سفر کے اثنا میں حضرت ابوطالب اور آپ سرجیس نام ایک نسطوری راہب کے ہاں ٹھیرے تھے جس نے آپ کو مذہب عیسوی کی تعلیم دی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے کم عمر بچہ کو کوئی راہب کیا تعلیم دے سکتا ہے۔ غالباً نسطوری راہب کے اس واقعہ میں بہت مبالغہ کیا جاتا ہے کیونکہ آنحضرتؐ کی عمر اُس وقت صرف چودہ سال تھی۔ اور آپ عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ شام میں بہت سی باتیں آپ کے لئے بالکل نئی اور سمجھ سے باہر تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کی نگاہوں نے وہاں بہت سی چیزیں دیکھیں اور ان کے عکس کو محفوظ کر لیا جو اگرچہ اُس وقت ایک معمہ رہا لیکن بعد میں چل کر عجیب و غریب

طریقہ سے مختلف نظریات اور معتقدات کی صورت میں نمایاں ہوا۔ غرض
اغلب یہ ہے کہ شام کے سفر آنحضرتؐ کی آیندہ زندگی کے بہت سے اہم واقعات
کا پیش خیمہ تھے ۔

ایک اور ضروری بات جو ہمیں ذہن نشین رکھنی چاہیئے یہ ہے کہ آپ نے
کسی مکتب میں تعلیم نہیں پائی تھی جن معنوں میں ہم آجکل مکتب کی تعلیم
استعمال کرتے ہیں وہ آپ کو بالکل حاصل نہیں تھی۔ عرب میں لکھنے کا رواج
اسی زمانہ میں شروع ہوا تھا۔ اور یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ آپ لکھنا
بالکل نہیں جانتے تھے۔ ریگستان کی زندگی اور اس کے تجربات آپ کی کل
تعلیم تھے۔ اس کائنات کے متعلق آپ کے معلومات صرف انہی مشاہدات
پر مبنی تھے جن کا آپ کو اس غیر معروف ماحول میں صرف اپنی نگاہوں
اور اپنے خیالات کے ذریعہ موقع ملا تھا۔ غور کرو تو یہ امر نہایت حیرت انگیز
معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کتابی علم سے بالکل ناآشنا تھے۔ اور آپ کا ذریعہ
معلومات تمام تر وہی تھا۔ جو آپ اپنی نگاہوں سے دیکھتے تھے یا جو اس

دور افتادہ ریگزار عرب میں کچھ اڑتی اڑتی خبریں سن لیتے تھے، علم و حکمت کا
وہ ذخیرہ جو آپ کے گرد و پیش یا آپ سے دور اور اقطاع عالم میں موجود تھا
آپ اس سے کوئی استفادہ نہ کر سکتے تھے اور اُن محترم مشعل بردار حقیقت ہستیوں
میں سے (جو مختلف ملکوں اور عہدوں میں گزری ہیں۔) کوئی بھی آپ سے
براہ راست شرف تکلم حاصل نہ کر سکتی تھی۔ اس سینۂ صحرا کی گہرائی میں آپ بالکل
تنہا رہے اور صرف درسگاہِ فطرت اور اپنے خیالات کی فضا میں نشو و نما پائی۔

لیکن کہا جاتا ہے کہ ابتدائے عمر سے آپ میں غور و فکر کی عادت تھی۔
آپ اپنے حلقۂ احباب میں "الامین" کے لقب سے یاد کئے جاتے کیونکہ حقیقت
شعار اور وفادار تھے۔ آپ کا ہر فعل ہر قول اور ہر خیال صداقت و دیانت پر
مبنی ہوتا تھا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ آپ کا ہر قول پُر معنی ہوتا۔ آپ کم سخن
تھے۔ اور بے ضرورت بات نہیں کرتے تھے لیکن جب کبھی بات کرتے
تو آپ کی گفتگو مدبرانہ، حکیمانہ اور مخلصانہ ہوتی اور ہمیشہ نفسِ مطلب پر روشنی ڈالتی
اسی قسم کا کلام گفتگو کے قابل ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ساری عمر لوگ آپکو

نہایت متین. محبت کرنے والا اور راستباز سمجھتے رہے۔ باوجود فطری سنجیدگی اور اخلاص کے آپ متواضع، ملنسار، دوستی کے قابل اور خوش طبع تھے۔ اور ایک خندۂ دلفریب آپ کے چہرہ پر پایا جاتا تھا بعض لوگوں کی ہنسی ان کی ریاکاری کا آئینہ ہوتی ہے۔ وہ صحیح طور پر ہنس بھی نہیں سکتے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ صاحب جمال تھے۔ آپ کے حسین چہرہ سے ذکاوت و دیانت ٹپکتی تھی۔ آپ کا رنگ گندمی اور آنکھیں سیاہ چمکتی ہوئی تھیں مجھے تو آپ کی وہ رگ جبین بھی پیاری معلوم ہوتی ہے جو غصہ کے وقت پھول کر سیاہ ہو جاتی تھی۔ یہ بنو ہاشم کی ایک نشانی تھی۔ جو آنحضرتؐ کی پیشانی میں نمایاں طور پر پائی جاتی۔ آپ اولوالعزم اور جوشیلے ہونے کے ساتھ منصف مزاج اور صداقت پسند تھے۔ غرض ہم اس حالت میں اس ہستی کو تاتربیت یافتہ جوش و حرارت سے لبریز قلب صحرا میں اپنا کارنامۂ زندگی مرتب کرتے دیکھتے ہیں۔ اسی زمانہ میں خدیجہ نام ایک متمول بیوہ سے آپ کا تعارف ہوا جن کا اسباب تجارت لے کر آپ پھر شام

تشریف لے گئے، اور نہایت حسن و خوبی سے خدمت مفوضہ انجام دے کر ان سے
خراج تحسین وصول کیا۔ عرب مورخین نے آپ کی شادی کے نہایت دلچسپ
اور قرین قیاس واقعات لکھے ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر پچیس سال کی تھی
اور حضرت خدیجہؓ اگرچہ چالیس سال کی ہو چکی تھیں لیکن ہنوز ان کے چہرہ سے
حسن کے آثار زائل نہیں ہوئے تھے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس محسن بیوی سے
آپ کے تعلقات نہایت محبت آگیں خوشگوار اور شگفتہ تھے۔ آپ ہمیشہ انہیں
سچے دل سے چاہتے رہے اور ان کے سوا کسی اور سے محبت نہیں کی۔ یہ امر کہ آپ نے
جوش شباب کے ختم ہونے تک بالکل معمولی طریقہ پر اور نہایت سادگی و خاموشی
کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزارے بجائے خود ہمارے اس خیال کی تکذیب
کرتا ہے کہ آپ کی نیت میں کسی طرح کا مکر و فریب تھا۔ چالیس سال کی عمر
تک آپ نے کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ آپ کی زندگی کے تمام خلافِ
عادت واقعات۔ اصلی اور مفروضہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد یعنی
پچاسویں سال سے شروع ہوئے۔ اس وقت تک آپ کی ساری "ہوس"

پاک زندگی بسر کرنے کے لئے تھی اور آپ کی "شہرت" یعنے ہمسایوں کا خیال نیک آپ کے لئے بالکل کافی تھا جب بڑھاپا آپہنچا۔ ساری گرمی شباب ختم ہوگئی اور آپ کے لئے اس دنیا میں صرف اطمینان و عافیت ہی ایک چیز باقی رہی اُس وقت آپ کو ہوس پرستی کی سوجھی اور اپنے سارے گزشتہ خصائل و فضائل پر پانی پھیر کر ایک ایسی شئے کے لئے مکر و فریب اختیار کیا جس سے اب کسی طرح متمتع نہ ہوسکتے تھے۔ اپنی حد تک تو میں ایسے قیاس کو کبھی تسلیم نہیں کرسکتا؛

نہیں نہیں! اس سیہ چشم۔ پاک طینت اور صاف باطن انسان میں (جسے مادر صحرا نے اپنے آغوش شفقت میں پالا تھا) جذبہ ہوس پرستی اور شہرت طلبی نہیں بلکہ کچھ اور ہی خیالات موجزن تھے۔ یہ اُس قسم کی بزرگ و برتر جان پاک تھی جسے خلوص و صداقت کے بغیر گذر ہی نہیں جس کے خمیر میں خود فطرت اخلاص کو جگہ دیتی ہے۔ جس وقت اور لوگ اوہام میں مبتلا تھے اور اسی پر اڑے رہنے کے لئے جنگ و جدل کر رہے تھے۔ اس شخص کی عقل پر وہم و گمان کا پردہ نہ پڑسکا وہ اپنی روح اور حقائق اشیاء کے ساتھ سب سے الگ تھا

جیسا کہ میں کہہ چکا اس کی نگاہوں کے سامنے راز ہستی اپنے بیم و رجا کے ساتھ روز روشن کی طرح عیاں تھا جس کے وجود کو کسی طرح کا وہم و گمان پوشیدہ نہ کر سکا یہ صفت جسے ہم نے "خلوص" کے لفظ سے تعبیر کیا درحقیقت صفاتِ ایزدی کا ایک پرتو ہے اور ایسے انسان کی آواز دراصل ہاتفِ غیب کی آواز ہے جسے لوگ انتہائی توجہ سے سنتے ہیں۔ اور انہیں سننا چاہئے کیونکہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔

مدت دراز سے سفر اور حضر میں ہزاروں خیالات اس شخص کے دل میں موجزن تھے کہ "میں کون ہوں اور یہ لاانتہا شے کیا ہے جس میں میں رہتا ہوں اور جو اصطلاح عام میں "کائنات" کہلاتی ہے؟ موت و حیات کیا چیز ہے۔ اور میرا ایقان و عمل کیا ہونا چاہئے؟ کوہ حرا اور کوہ سینا کی ہیبت ناک چٹانیں ریگ بیابان اور انجم فلک اس کا جواب دینے سے قاصر تھے۔ آخر اس انسانی روح پاک اور الہام ربانی کو جو اس روح پاک میں جلوہ گر تھا ان مسائل کا حل کرنا پڑا۔

یہ ایسے مسائل ہیں جن کے متعلق ہر شخص کو اپنے دل سے سوال کرنا چاہیئے اور جن کا حل معلوم کرنا خود ہمارا بھی فرض ہے۔ اس امی شخص کے نزدیک یہ مسائل اس درجہ اہم تھے کہ ان کے مقابلہ میں وہ باقی تمام چیزوں کو ہیچ سمجھتا تھا۔ یونانیوں کے پیچیدہ مذہبی مناظرات۔ یہودیوں کے مبہم قدیم روایات۔ عربوں کی احمقانہ رسم بت پرستی غرض کسی چیز میں اُسے ان مسائل کا حل نہ ملتا تھا۔ ہیرو کی پہلی خصوصیت جسے اُس کے تمام خصوصیات کی ابتدا اور انتہا کہنا بجا ہوگا یہ ہے کہ وہ اشیا کی صورت ظاہری سے اُن کی حقیقت کو جا پہنچتا ہے رسم و رواج معتبر اور مقبول روایات اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی لیکن ان سب کو اس حقیقت کا مظہر ہونا چاہیئے جس کے مطابق اگر یہ نہوں تو محض بت پرستیاں ہیں۔ جس طرح کہ لکڑی کا ٹکڑا اگر خدائی کا دعوی کرے تو ایک حقیقت جو طبیعت کے لئے مضحکہ خیز اور نفرت انگیز ہو جائے گا۔ بہترین طلائی اسام کے ہوئے بت جنکی سرداران قریش پرستش کرتے تھے اس شخص کے کس کام کے ؟ گو ساری دنیا ان کی پرستش کرے لیکن کیا حاصل ؟ اس کی (آنحضرت کی) نگاہوں کے سامنے

تو حقیقتِ کبریٰ روز روشن کی طرح عیاں تھی جسے یا تو وہ قبول کرے یا فنا ہو جائے اور اس کے قبول یا رد کرنے کا صرف یہی وقت تھا اس کے بعد بدتک پھر کوئی موقع نہ تھا حقیقت ازلی اس سے اس سطالبہ کا جواب طلب کرتی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ ہوس اس کے افعال کی محرک تھی۔ تو یہ امر غور طلب ہو جاتا ہے کہ سارے عرب میں وہ کونسی چیز تھی۔ جو اُس کو مطمئن کر سکتی؟ ہرقل یوناں کا تاج۔ خسرو ایران کا تاج غرض ساری دنیا کے تاج و تخت اسکے کس کام کے تھے؟ جبکہ اس دنیا کے معاملات ہی اُس کے پیش نظر نہ تھے بلکہ بہشت و دوزخ کے مسائل۔ دنیا کے تمام تاج و تخت چند روز کے بعد کیا ہو جاتے؟ کیا شیخ مکہ یا شاہ عرب بنکر عصائے شاہی ہاتھ میں لے لینے سے نجات عقبےٰ حاصل ہو جاتی ہے؟ میرا یہ قطعی خیال ہے کہ نہیں حاصل ہو سکتی اس لئے اس خیال کو بعید از قیاس بلکہ ناقابل برداشت قرار دے کر دل سے دور کر دینا چاہیئے کہ آنحضرتؐ نے جو کچھ کیا وہ از راہ مکر و فریب تھا۔

آنحضرتؐ کی عادت تھی کہ ہر سال ماہ رمضان میں خلوت گزین ہو جاتے

یہ اُس زمانہ میں عرب کا عام دستور تھا جو ہر اُئینہ قابل ستائش ہے خصوصاً
آنحضرتؐ سے انسان کے لئے تو یہ بالکل فطری اور نہایت سودمند ثابت ہوگا
کیونکہ پہاڑوں کی پُرسکوت فضا میں خاموشی کیساتھ غور وفکر کرنیکا طریقہ بہت عمدہ ہے،
آنحضرتؐ کی عمر کا چالیسواں سال تھا آپ ماہ رمضان
تسبیح وتحلیل اور ان مسائل پر غور وفکر میں بسر کرنے کی غرض سے
مکہ کے قریب کوہِ حرا کے ایک غار میں تشریف لے گئے تھے کہ ایک دن آپ نے
اپنی بیوی خدیجہؓ سے (جو اس سال وہیں قریب ہی رہتی تھیں) فرمایا کہ فضل
باری تعالیٰ سے تمام عقدے حل ہوگئے میرے سارے شکوک وشبہات رفع
ہوگئے اور اب میں حقائق ومعارف کو بے نقاب دیکھ رہا ہوں۔ یہ تمام اصنام
وعقائد مہمل ہیں مٹی کے کھلونے ہیں سارے عالم کا مالک خدائے واحد ہے
ہمیں ان تمام بتوں سے منہ موڑکر اُسی ذات واحد کے آگے سر جھکانا چاہئے،
صرف وہی ایک ذات بزرگ وبرتر ہے، اوس کے سوا عظمت ورفعت کا کوئی
شایاں نہیں۔ وہ حقیقت ہے یہ بت مجاز۔ اُسی نے ہمیں پیدا کیا۔ وہی ہمیں

پال رہا ہے اور ہم سب اسی کا پرتو ہیں۔ اُسی حسنِ ازل کی ایک عارضی نقاب میں
"اللہ اکبر" یعنی خدا بزرگ و برتر ہے اور "اسلام" یعنے راضی برضائے الٰہی رہنا۔ یہ سمجھنا
کہ ہماری ساری قوت اسی کی کامل اطاعت میں مضمر ہے۔ وہ ہماری دنیا اور آخرت
کے لئے جو چاہے کرے۔ جو کچھ وہ ہمارے لئے بھیجے خواہ وہ موت ہو یا موت سے
بدتر کوئی چیز۔ وہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ ہم اپنے کو اُسی کے حوالے کرتے ہیں"
گوئٹے[1] کہتا ہے کہ "اگر اسی کا نام اسلام ہے تو کیا ہم سب مسلمان نہیں
ہیں؟" بیشک! ہم میں سے جو ذرا بھی زیور اخلاق سے آراستہ ہیں وہ اسی
عقیدہ کے پابند ہیں۔ عقل انسانی کا منتہائے کمال یہ نہیں ہے کہ وہ تقدیر کے آگے
سپر ڈال دے (کیونکہ قدرت تو اسے مطیع و منقاد کر کے رہیگی۔) بلکہ یہ علم اور یقین
کہ تقدیر نے ہمارے لئے جو چیز تجویز کی وہی بہترین ہے۔ اس کا یہ فرض ہے

---

[1] یوہان ولف گینگ گوئٹے (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء) جرمنی کا مشہور شاعر ہے جس نے سائنس میں
بھی بعض اہم انکشافات کئے ہیں۔

کہ کارخانۂ قدرت میں اپنی عقلِ نارسا کو دخل نہ دے اور یہ سمجھ لے کہ گو اس کی عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی لیکن درحقیقت یہ انتظامات ایک منصفانہ قانون کے تحت عمل میں آرہے ہیں جس کی غایت نیک ہے۔ اور اس کا کام اس قانون کا ساتھ دینا اور بے چون وچرا اس کی پابندی کرتا ہے۔

یہی میرے نزدیک وہ صحیح درس اخلاق ہے جس کا اب تک علم ہو سکا جونہی انسان تمام سطحی قوانین۔ عارضی حالات اور اندیشۂ سود وزیاں سے قطع نظر کرکے اس عالمگیر قانون کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ صداقت و نیکی اور فتح و نصرت کی شاہراہ پر جا پہنچتا ہے اُس کی فتحمندی کا انحصار صرف اسی عظیم الشان مرکزی قانون کے ساتھ اتحادِ عمل پر ہے جس کے بغیر وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس اتحاد عمل کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ایقان ہے کہ ایسا کوئی قانون وجود رکھتا ہے اور یہ کہ وہ قانون سراسر مصلحت پر مبنی ہے یہی اسلام کی روح رواں ہے اور یہی عیسائیت کا حاصل کیونکہ اسلام عیسائیت کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اگر یہ نہوتی تو یہ بھی نہوتا۔ عیسائیت بھی سب سے زیادہ راضی برضائے الٰہی

رہنے پر زور دیتی ہے۔ اُس کے احکام کی رو سے ہمیں نفس سے مشورہ کرنے، اعتراضات لایعنی کی طرف متوجہ ہونے اور ارمان و آلام لاحاصل پر اعتنا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور ہماری نگاہوں کو جو چیز بدترین اور نہایت ظالمانہ معلوم ہوتی ہے وہ دراصل ایسی نہیں ہو کچھ پیش آئے اُسے مشیت ایزدی سمجھکر برداشت کرنا اور یہہ کہنا چاہئے کہ خدا دانا بینا ہے۔ اُس کی اسی میں کچھ مصلحت ہوگی۔ وہ مجھے ہلاک کر ڈالے تب بھی میں اپنے کو اُسی کے حوالہ کرونگا۔ اسلام عبارت ہے اپنا نفس اور نفس کشی سے۔ یہ عقل کا وہ نقطۂ اعلیٰ ہے جو قدرت اس دنیا پر اب تک منکشف کر سکی۔ اور یہی وہ نور ہے جو اس امی سید عربیؐ کی ظلمت روحانی دور کرنے کے لئے ظاہر ہوا تھا حیات سرمدی کے اس مہر منور کو جو ظلمت کدۂ موت میں طلوع ہوا تھا آنحضرتؐ نے "وحی" اور "فرشتہ جبرئیل" کے نام سے موسوم کیا۔ کیا آج بھی کوئی بتا سکتا ہے کہ اُسے اور کس لفظ سے تعبیر کرنا چاہئے؟ ہماری عقل انعام ربانی کا ایک پرتو ہے۔ حقائق کو جاننا اور اشیا کی ماہیت پہچاننا ایک ایسا وجدانی فعل ہے جس کی توضیح بہترین منطق بھی

نہیں کرسکتی۔ نووالس[1] کا قول ہے کہ کیا ایمان بالغیب وجود باری تعالے کو بہترین طور پر ثابت نہیں کرتا"؟ آنحضرت صلعم کی روح کے لئے جو اس حقیقت کبریٰ سے معمور تھی۔ یہ بالکل فطری امر تھا کہ وہ اس کو اور صرف اسی کو دنیا کی ایک اہم چیز تصور کرتی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظلمت وہلاکت سے بچاکر اس حقیقت عظمیٰ کے انکشاف سے سرفراز فرمایا تھا اس لئے آپ کا یہ فرض تھا کہ اس پیغام کو ساری مخلوق تک پہنچائیں۔

"محمد الرسول اللہ" کے یہی معنی ہیں اور اس لحاظ سے کلمہ کا یہ جزو بھی بالکل صحیح ہے۔

ہم سمجھ سکتے ہیں کہ خوش صفات خدیجہؓ نے آپ کے اس بیان کو تعجب اور رشک کے ساتھ سنا ہوگا۔ لیکن بالآخر انھوں نے جواب دیا کہ "جو کچھ آپ نے فرمایا بالکل صحیح ہے"۔

---

[1] نووالس د ۱۷۷۲ء سنہ ۱۸۰۱ء جرمنی کا ممتاز شاعر اور ناول نویس۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ اس جواب سے حضرت خدیجہؓ کے کسقدر شکور ہوئے ہوں گے اور اُن کے تمام احسانات میں اس مخلصانہ کلام کے تسلیم کر لینے کو کیا درجہ دیا ہوگا۔ نوالس کا قول ہے کہ "جس لمحہ میرے عقیدہ کو کوئی اور شخص تسلیم کرتا ہے۔ وہ بے انتہا مستحکم ہو جاتا ہے"۔ کوئی شبہ نہیں کہ عنایت و مہربانی کا یہ انتہائی درجہ ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ آخر عمر تک حضرت خدیجہؓ کو نہیں بھول سکے۔ اس واقعہ کے بہت عرصہ بعد ایک دفعہ آپ کی کمسن اور محبوب بیوی حضرت عائشہؓ نے (جو اپنے مختلف خصوصیات کے باعث عالم اسلام میں بہت ممتاز ہیں) آپ سے پوچھا کہ "کیا میں خدیجہؓ سے بہتر نہیں ہوں؟ وہ تو بیوہ بوڑھی اور بدصورت ہو گئی تھیں۔ کیا آپ مجھے اُن سے زیادہ نہیں چاہتے؟" آنحضرت نے فرمایا "قسم ہے رب العالمین کی میں اون کو تم سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ وہ مجھ پر اُس وقت ایمان لائیں جب کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ ساری دنیا میں میرا صرف ایک دوست تھا اور وہ خدیجہؓ تھیں"۔ حضرت خدیجہؓ کے علاوہ آپ کے چچا زاد بھائی علی ابن ابی طالبؓ اور آپ کے

غلام زید رضؓ پہلے مسلمان ہیں ؛

آنحضرت نے اپنے عقائد کا مختلف لوگوں پر اظہار کیا لیکن اکثر نے اسے بے اعتنائی اور تمسخر کے ساتھ سنا اور تین سال کی مدت میں میں سمجھتا ہوں کہ شاید آپ صرف تیرہ آدمیوں کو مسلمان کر سکے۔ آپ کی ترقی کی رفتار دھیمی تھی۔ اور آپ کے موجبات ترغیب وہی تھے جو عموماً ایسی صورتوں میں ایسے انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ تین سال کی معمولی کامیابی کے بعد ایک دفعہ آپ نے اپنے اقربا میں سے چالیس آدمیوں کو مدعو کیا اور ان کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے عقائد کا اظہار فرمایا اور کہا کہ "مجھے اس پیغام کو ساری نوع انسان تک پہنچانا ہے۔ یہ دنیا کے لئے اعلیٰ ترین بلکہ یکتا نعمت ہے۔ آپ لوگوں میں سے کون میرا ساتھ دیگا! اس ساکت اور شک بھرے مجمع میں سے صرف ایک حضرت علیؓ (جنکی عمر سولہ سال تھی) اس خموشی کو برداشت نہ کر سکے۔ اور کھڑے ہوکر پرجوش لہجہ میں کہا کہ "میں آپ کا ساتھ دونگا"۔ یہ مجلس جس میں حضرت علیؓ کے والد ابوطالبؓ بھی شامل تھے، گو آنحضرتؐ کے خلاف نہ تھی لیکن ایک پیر ناخواندہ اور

ایک طفل شانزدہ سالہ کا ساری نوع انسان کے خلاف اس اہم کا فیصلہ کرنا اُسے مضحکہ خیز معلوم ہوا اور تمام اہل محفل قہقہے لگاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن زمانہ نے چلکر ثابت کر دیا کہ یہ ہنسی کے قابل بات نہ تھی بلکہ نہایت اہم معاملہ تھا؛

حضرت علیؓ کے صفات تو ایسے ہیں کہ ان پر بے اختیار محبت آتی ہے انھوں نے ہر موقع پر اپنے کو نہایت شریف النفس محبت آشنا اور جری ثابت کیا ہے۔ ان میں ایک عجیب طرح کی شجاعت پائی جاتی ہے اور شیر کی سی دلیری کے باوجود مروت۔ صداقت اور محبت کا ایسا جلوہ نظر آتا ہے جو سچی نائٹ کے شایاں ہے۔ آپ نے اپنی انتہائی نیکی کی وجہ سے دوسروں کی نیکی پر اعتماد کیا اور اسی کے باعث بغدادؔ کی ایک مسجد میں شہید ہوئے۔ شہادت سے پہلے

معلوم ہوتا ہے کہ تقریر کی رو میں مسٹر کارلائل بجائے کوفہ کے بغداد کہہ گئے کیونکہ حضرت علیؓ کی شہادت کوفہ میں واقع ہوئی اور بغداد اس واقعہ کے تقریباً ایک صدی بعد خلیفہ منصور عباسی کے عہد میں آباد ہوا۔

آپ نے فرمایا کہ "اگر زخم مہلک ثابت نہو تو قاتل کو معاف کر دینا ورنہ اس سے فوراً قصاص لینا تاکہ ہم دونوں ایک ہی وقت دربار رب العزت میں حاضر ہوں اور وہاں اس کا فیصلہ ہو جائے کہ ہم میں سے کون برسر حق تھا"

آنحضرت کی تبلیغ قدرتاً قریش کو ناگوار گذری جو کعبہ کے پاسبان اور بتوں کے متولی تھے۔ دو ایک ذی اثر آدمی اسلام لے آئے تھے، اسلام گو آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا لیکن اوس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا تھا جس سے ہر شخص ناراض ہو رہا تھا اور کہتا تھا کہ "یہ کون ہیں جو اپنے کو ہم سب سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں ہمیں احمق اور ہمارے بتوں کو لکڑی کے کھلونے ٹھیراتے ہیں" آخر آپ کے خوش صفات چچا ابو طالب نے آپ سے کہا "جان عم! کیا تم اس تبلیغ سے باز نہیں آسکتے؟ اپنی حد تک اس عقیدہ کے پابند رہو لیکن اس کا چرچا کر کے دوسروں کو پریشان کرنے سرداران قبائل کو ناراض کرنے اور ہمیں اور خود اپنے کو خطرہ میں ڈالنے سے کیا حاصل؟"

آنحضرتؐ نے یہ سن کر جواب دیا کہ "اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند آکر اس تبلیغ سے باز رہنے کی خواہش کرے تو بھی میں اس کی تعمیل نہیں کر سکتا۔"

اس پیغام صداقت میں جو آپ لے کر آئے تھے ایک ایسا فطری عنصر شامل تھا جو درجہ میں آفتاب، ماہتاب بلکہ خود فطرت کی کسی صنعت سے کم نہ تھا۔ یہ عنصر مہ و خورشید اور تمام انسانوں اور اشیاء کی مخالفت کے باوجود اُس وقت تک اپنا اظہار کرتا رہے گا جب تک اُسے خدا تعالےٰ کا حکم ہوا وہ اس پر مجبور تھا جس کے سوا اُسے کوئی چارہ نہ تھا۔

آنحضرتؐ کا یہ ارشاد چونکہ مسٹر کارلائل نے کسی ترجمہ سے نقل کیا ہے اس لئے اس کے اصلی مفہوم میں غلطی ہو گئی ہے۔ آنحضرتؐ نے یہ فرمایا تھا کہ "اگر لوگ آفتاب کو میرے داہنے ہاتھ میں اور ماہتاب کو میرے بائیں ہاتھ میں رکھدیں تب بھی میں اس تبلیغ سے باز نہیں آسکتا۔" آپ کے اصلی الفاظ یہ ہیں :—

بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ یہ جواب دیکر رونے لگے کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ ابو طالب کو آپ کے ساتھ محبت ہے اور یہ خدمت جو آپ کے تفویض ہوئی کوئی آسان نہیں بلکہ نہایت دشوار اور عظیم الشان تھی:

غرض جو شخص آپ کی طرف متوجہ ہوتا آپ اُس سے اسی کے متعلق گفتگو کرتے اور جو زائرین مکہ آتے اُن پر اپنے عقائد کا اظہار فرماتے۔ اس طرح آپ کے معتقدین کی تعداد میں تدریجی اضافہ ہوتا گیا لیکن اس کے ساتھ آپ سے کفار کا باہم اختلاف تنفر اور خطرات بھی بڑھتے گئے آپ کے ذی اقتدار اعزہ نے اگرچہ پہلے پہل آپ کی حمایت کی لیکن رفتہ رفتہ خود

يَا عَمِّ وَاللهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِينِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلَى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللهُ اَوْ اَهْلِكَ فِيهِ مَا تَرَكْتُهُ

(ابن ہشام صفحہ ۱۷۰)

بعض محدثین اس حدیث کی تعبیر کرتے ہیں کہ آفتاب سے آپ کی مراد تکلیف اور ماہتاب سے راحت تھی یعنی کفار خواہ مجھے دنیا کی تمام تکلیفیں پہنچائیں یا راحتیں دیں کسی طرح اس تبلیغ سے باز نہیں آسکتا۔

آپ ہی کے ایماء سے تمام مسلمانوں کو مکہ چھوڑ کر سمندر پار حبشہ میں پناہ لینی پڑی۔
قریش کی برہمی بڑھتی گئی اور انہوں نے آپکو قتل کرنیکے لئے حلف اٹھائے اور منصوبے
باندھے ابوطالبؓ اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اگرچہ آنحضرتؐ ہماری ہمدردی
کے محتاج نہیں لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس زمانہ میں آپکی حالت نہایت دردناک
تھی آپ کو غاروں میں چھپنا پڑا بھیس بدلکر رہنا پڑا۔ بے خانماں پھرنا پڑا۔ اس کے
باوجود ہمیشہ جان کا خطرہ لگا رہا بعض دفعہ آپ کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی بعض
دفعہ آپ بال بال بچے کبھی تو آپکے دشمن کا گھوڑا بھڑک گیا۔ کبھی ایسا ہی کوئی اور
واقعہ پیش آگیا۔ ورنہ آپ اور آپکے تعلیمات دم میں ختم ہو جاتے اور دنیا کو اس کی
خبر بھی نہوتی لیکن کارکنان قضا و قدر کو اسکا اس طرح ختم کر دینا منظور نہ تھا۔

نبوت کا تیرھواں سال تھا۔ کہ آخر آپکے اعدائے ہر قبیلہ سے ایک شخص منتخب
کرکے چالیس آدمیوں کی ایک جماعت تیار کی جس نے آپ کے قتل کا عہد و پیمان
کر لیا۔ یہ حال دیکھکر آپ نے یثرب کا قصد فرمایا۔ جہاں کے کچھ لوگ مسلمان
ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے یہ مقام اب مدینہ یا مدینۃ النبیؐ کہلاتا ہے۔ مکہ سے

اس کا فاصلہ دو سو میل ہے اور راستہ میں تمام تر کوہ و بیابان واقع ہیں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی طبیعت کا اُس وقت کیا عالم ہوگا۔ اسی حالت میں بہزار دقت و دشواری آپ مدینہ پہنچے جہاں آپ کا پرجوش استقبال ہوا۔ شرقی سنہ کا آغاز اسی واقعۂ ہجرت سے ہوتا ہے۔ ہجری سنہ عیسوی سنہ ۶۲۲ء کے مطابق ہے۔ اُس وقت آنحضرتؐ کی عمر ترپن سال کی تھی۔ آپ بوڑھے ہو چکے تھے۔ اور آپ کے احباب ایک ایک کرکے دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، آپ کا راستہ سنسان اور پرخطر تھا۔ اور بجز اس کے کہ خود آپ کا دل نور امید سے روشن ہو ظاہری صورت حال نہایت تاریک تھی۔ ایسی صورتوں میں سب آدمیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ اب تک آنحضرتؐ نے صرف ترغیب و تلقین کے ذریعہ اپنے مذہب کی اشاعت فرمائی تھی لیکن جب ستم شعار اعدا نے آپ کو بے رحمی کیساتھ وطن سے نکالدیا۔ اور نہ صرف اس پیغام ایزدی کی طرف سے بے اعتنائی کی بلکہ آپکی جان کے بھی دشمن ہوئے تو مادر صحرا کے اس پرجوش فرزند نے اس طرح اپنی مدافعت کا تہیہ کیا جو ایک انسان اور ایک عرب کے شایاں تھا۔ اس نے کہا کہ "اگر

قریش اسی پر تلے ہوئے ہیں۔ تو یہی سہی۔ یہ لوگ اس پیغام کو نہیں سنتے جو ان کے اور تمام نوع انسان کیلئے بے انتہا اہم ہے اور چاہتے ہیں کہ اسے جبر و تشدد اور قتل و غارت کے ذریعہ دبا دیں۔ اچھا! تو انہیں شمشیر آزمائی بھی کر لینے دو۔" اس کے بعد آنحضرتؐ کو دس سال اور ملے جو سخت جنگ و جدل اور جد و جہد میں صرف ہوئے اس شدید کشمکش کا جو نتیجہ نکلا وہ آج ہمارے پیش نظر ہے ؛

اسلام کے بزور شمشیر پھیلنے کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مذہب عیسوی کے پیروؤں کیلئے یہ امر باعث فخر ہے۔ کہ وہ نہایت امن و سکون کے ساتھ صرف تعلیم و تلقین کے ذریعہ پھیلا لیکن اگر ہم کسی مذہب کی صداقت کا معیار اسی کو قرار دے لیں تو یہ ایک بنیادی غلطی ہوگی۔ تلوار استعمال بیشک ہوئی مگر سوال یہ ہے کہ یہ تلوار آئی کہاں سے؟ ہر نیا خیال ابتداً ایک ہی شخص کے دماغ میں پیدا ہوتا اور اسی میں جاگزین رہتا ہے۔ ساری دنیا میں صرف ایک انسان اپنے تمام ابنائے جنس کے خلاف اس کا پابند ہوتا ہے۔ اگر وہ اکیلا تلوار لیکر اس خیال کی اشاعت کرنا چاہے تو شاید ہی کچھ حاصل ہو۔ اس لئے پہلے تو اسے

تلواریں بہم پہنچانی پڑینگی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خیال خود بخود دست اختیار کرتا جاتا ہے۔ مذہب عیسوی کا دامن بھی ہمیں انسانی خون کے دھبوں سے پاک نہیں نظر آتا۔ جب اُس کے ہاتھ میں تلوار آئی تو اُس نے بھی اس کا استعمال کیا ہے شارلیمن کے عہد میں سیکسنیوں کا تبدیل مذہب تبلیغ کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس لئے زور شمشیر کا اعتراض میری رائے میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ میرے نزدیک اس دنیا میں ہر شئے کو جد وجہد کا حق حاصل ہے۔ خواہ وہ زبان سے ہو یا تلوار سے یا کسی اور ایسے ذریعہ سے جو اُسے میسر آجائے۔ وہ ہر چند تبلیغ و تلقین کرے۔ لڑے جھگڑے اور ایڑی چوٹی کا زور لگائے لیکن انجام کسی ایسی چیز پر غالب نہ آسکے گی جو مغلوب ہونیکی مستحق نہ ہو۔ جو چیز اس سے بہتر ہے۔ وہ اُسے ہرگز زیر نہیں کرسکتی البتہ جو چیز اس سے بدتر ہے اُس پر وہ ضرور قابو پائیگی۔ اس مبارزت عظمیٰ میں خود قدرت ثالث ہے۔ جو کبھی غلطی نہیں کرسکتی اور آخر کار وہی شئے فروغ پائے گی جو سب سے

شارلیمین (۷۴۲ء تا ۸۱۴ء) شہنشاہ فرانس جس نے جرمنی کے باشندوں کو عیسائی کرنے کیلئے تیس سال تک ان کے خلاف جنگ کی۔ ان کے کئی شہروں کو تباہ و برباد کیا اور ان کی ملک میں خون کی ندیاں بہا دیں

زیادہ مطابق فطرت ہے۔ اور جسے ہم عام طور پر "صادق ترین" کہتے ہیں:

حضرت محمدؐ اور ان کی کامیابی کے سلسلہ میں یہ ذہن نشین رہے کہ قدرت ایسی اعلیٰ ثالث ہے، جس کی بزرگی حلم اور تحمل کی کوئی حد نہیں۔ مثال کیلئے آپ تھوڑے سے گیہوں لیکر زمین میں ڈالدیجئے۔ گیہوں مٹی بھوسی۔ گھاس خاک، غرض دنیا بھر کے آخور میں مل جائیں۔ کوئی ہرج نہیں۔ آپ نے چونکہ انھیں حق پسند اور مہربان زمین کے سپرد کیا ہے۔ وہ اس سارے آخور کو خوشی کیساتھ جذب کرلیتی ہے اور گیہوں کی بالیاں نمایاں کردیتی ہے۔ وہ اس تمام خس و خاشاک کے متعلق کچھ نہیں کہتی بلکہ اُسے بھی کسی نہ کسی کام میں لے آتی ہے اور گیہوں کی لہلہاتی بالیاں چھوڑ جاتی ہے۔ مادر فطرت کا ہر جگہ یہی حال ہے۔ وہ صادق ہے اور اپنی صداقت کے اظہار میں بزرگی۔ انصاف اور مادرانہ شفقت سے کام لیتی ہے۔ ہر چیز میں وہ اصلیت کو ڈھونڈھتی ہے۔ اگر وہ اصلی ہوئی تو اس کی حفاظت کرتی ہے۔ ورنہ نہیں۔ اب تک جتنی چیزوں کی اس نے حفاظت کی ان سب میں صداقت کی ایک روح پائی جاتی ہے۔

افسوس! اعلیٰ ترین حقائق جو اب تک ظہور میں آئے ان سب کا قالب ناکمل رہا۔ یعنے ایک عنصر لطیف قالب کثیف میں ظاہر ہوا کیونکہ ہماری نگاہوں کے لئے ضروری تھا۔ کہ وہ حقائق خالص منطقی پیرہن میں نمودار ہوں اور نرے سائنٹفک دلائل سے ثابت کئے جائیں جو کبھی مکمل نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک نہ ایک دن ناکمل اور غلط ثابت ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح گو تمام حقائق کا قالب ایک دن مٹ جاتا ہے، لیکن ان سب میں ایک روح ہوتی ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی بلکہ خود انسانی کی طرح ہمیشہ ایک نئے اور بہتر لباس میں غیر فانی رہتی ہے۔ یہ خاصۂ فطرت ہے کہ وہ صداقت کی اصلی روح کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتی البتہ اس کا معیار انتخاب یہی ہے کہ وہ اصلی ہو قلزم فطرت سے نکلی ہوئی ایک آواز ہو ہم جسے اچھا یا برا کہتے ہیں۔ وہ اس کے نزدیک اصل سوال نہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ تم میں کسقدر آلایش ہے۔ بلکہ یہ دیکھتی ہے۔ کہ تم میں کچھ جوہر بھی موجود ہے یا نہیں۔ اچھے تو بہت لوگ کہے جا سکتے ہیں۔ ہم آپ بھی اچھے بہت اچھے ہیں لیکن ہم میں اصلیت اور صداقت نہیں۔ بلکہ نمود و نمائش تصنع

اور بناوٹ ہے۔ ہم قلب کائنات سے ہمیشہ ناآشنا رہے ہیں صحیح معنوں میں ہم پر نہ نیک کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ بد کا۔ ہم ہیچ ہیں۔ فطرت کو ہم سے کوئی سروکار نہیں ٭

اسلام کو ہم نے ایک طرح کی عیسائیت سے تعبیر کیا ہے۔ اور فی الحقیقت جس والہانہ گرمجوشی سے لوگوں نے اُسے قبول کیا۔ اس پر نظر کرتے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن مہمل شامی فرقوں سے بہتر تھا جو صرف اس مسئلہ کے متعلق بر سرِ پیکار رہتے کہ آیا اقانیم ثلاثہ ہم جوہر ہیں یا صرف باپ بیٹے (یعنی خدا اور مسیح) ہم جوہر ہیں اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دماغ تو لا یعنی شور و غل سے معمور ہو گیا لیکن دل بالکل منجمد اور معرا رہا۔

اسلام کی صداقت بھی غلط اور باطل عقائد میں لپٹ گئی ہے لیکن اس پر اسکی صداقت کی وجہ سے ایمان لایا جاتا ہے نہ کہ اس باطل کی آمیزش کی وجہ سے۔ اسلام مسیحیت کی بگڑی ہوئی لیکن ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس کے قلب میں حرکت محسوس ہوتی ہے۔ وہ محض ایک بے جان منطقی گورکھ دھندا نہیں۔ بادیہ صحرا کے اس غیر تعلیمیافتہ فرزند آنحضرتؐ نے اپنے پرخلوص اور روشن ضمیر کے ذریعہ

اجو موت وحیات کی طرح صداقت سے معمور تھا) اور اپنی نگاہِ حقیقت آشنا کی بدولت (جو بالکل خداداد تھی) عربوں کی لایعنی بت پرستی۔ یونانیوں اور یہودیوں کے مذہبی مناظرات۔ قدیم روایات۔ رسم ورواج اور فضول کج بحثیوں میں سے اصل حقیقت کو پالیا۔ اور فرمایا کہ "بت پرستی فعل عبث ہے۔ ان لکڑی کے بتوں کو تم لوگ تیل اور موم لگاتے ہو اور انھیں مکھیاں چمٹتی ہیں۔ یہ لکڑی کے ٹکڑے ہیں تمھارے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ لوچ اور مہمل، شرک اور کفر ہیں اگر تم انکی حقیقت سمجھو تو ان کا وجود دہشت خیز اور نفرت انگیز ہو جائے۔ بقا صرف خدا کی ذات کو ہے۔ قوت و اقتدار اسی کو حاصل ہے۔ اس نے ہم کو پیدا کیا۔ وہی ہم کو مار اور جلا سکتا ہے، "اللہ اکبر" اللہ بہت بڑا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ تمھارے حق میں وہی بہتر ہے جو وہ چاہے خواہ وہ تمھارے نفس کو کتنا ہی گراں گزرے لیکن تم اسی کو بہترین پاؤ گے۔ تم اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ دنیا اور عقبیٰ میں تمھارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

اگر وحشی بت پرستوں نے آپ کے اس پیغام کو قبول کر لیا۔ اور اس پر عمل پیرا ہونے کیلئے اسے اپنے حرارت بھرے سینوں میں جگہ دی تو کوئی تعجب کی بات

نہیں. میرے نزدیک وہ اسی طرح قبول کئے جانے کے قابل تھا کبھی نہ کسی صورت میں آج بھی یہی ایک ایسا پیغام ہے. جسے ہر شخص کو قبول کرنا چاہیئے. اس سے انسان اس معبدِ عالم کا سرنشین بن جاتا ہے. خالق جہاں کے احکام کا ہمصفیر ہو جاتا ہے. اور ان احکام کی احمقانہ مخالفت کے بجائے ان کے ساتھ اشتراک عمل کرنے لگتا ہے. آجتک مجھے فرض شناسی کی اس سے بہتر تعریف نہ معلوم ہوسکی. مقصد کائنات کا ساتھ دینے میں تمام محاسن شامل ہیں. اس سے انسان کو نیکی اور کامیابی حاصل ہوتی ہے. (کیونکہ مقصد کائنات کا کامیاب ہونا ضروری ہے) اور وہ صراط مستقیم پر رہتا ہے. عقیدہ تثلیث میں ذات و صفات کی فضول بحثیں جس شد و مد سے چاہیں جاری رہیں لیکن ان سب کا اگر کوئی مدعا ہوسکتا ہے تو یہی ہے، اگر وہ اس منشا کے ظاہر کرنے میں کامیاب نہوں تو مہمل ہیں. غور طلب امر یہ نہیں. کہ ان نظریوں اور منطقی مسئلوں کو صحیح طور پر الفاظ کا جامہ پہنایا گیا یا غلط طور پر بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ بنی آدم انہیں اپنے دل میں جگہ دینے کے لئے تیار ہیں یا نہیں. اسلام نے ان تمام مہمل مذہبی فرقوں کو مٹا دیا اور میری رائے میں اس کو اس کا حق حاصل تھا. وہ سراپا حقیقت تھا جو

خاص سینۂ فطرت سے از سر نو نمودار ہوا۔ عربوں کی بت پرستی۔ شامیوں کے عقائد غرض ہر اس مذہب کو جو اس کی طرح صداقت پر مبنی نہ تھا۔ اس کے آگے جھک جانا پڑا یہ مذاہب کئی اعتبار سے محض سوکھی لکڑی تھے جنہیں اسلام کی آتش صداقت نے جلا دیا۔

اسی جنگ و جدل اور جد و جہد کے زمانہ میں خصوصاً ہجرت کے بعد آنحضرتؐ نے وہ مقدس کتاب لکھوانی شروع کی جو قرآن کہلاتی ہے۔ یہی وہ کارنامہ ہے جسے آپ اور آپ کے اصحاب نے بڑی اہمیت دی اور ساری دنیا کے سامنے معجزہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ مسلمان قرآن کی اسقدر تعظیم کرتے ہیں کہ شاید ہی کوئی عیسائی اتنی انجیل کی کرتا ہو۔ یہ ہر جگہ تمام قوانین و اعمال کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ خیال و عمل کیلئے چراغ ہدایت سمجھا گیا ہے۔ یہ خدا کا وہ خاص پیغام مانا جاتا ہے جس پر ساری دنیا کو عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ اسلامی عدالتیں اس کی رو سے فیصلے صادر کرتی ہیں۔ ہر مسلمان اسکی تعلیم حاصل کرنا اور اسے اپنا مقدمہ زندگی بنانا فرض سمجھتا ہے۔ مسجدوں میں روزانہ اسکی تلاوت کیجاتی ہے۔ تیس تیس مولویوں کی ایک جماعت یکے بعد دیگرے روز اس کا ورد کرتی ہے۔ آج بارہ سو برس سے ہر وقت اس صحیفۂ گرامی کی آواز کروڑوں انسانوں کے

دل و دماغ میں گونج رہی ہے، بعض ایسے علمائے اسلام کا حال سننے میں آیا جنہوں نے اپنی عمر میں اس کے ستر ہزار دور کئے ہیں:

کیا حیرت کی بات ہے! اگر کسی شخص کو قومی مذاق کا اختلاف دیکھنا منظور ہو تو اس کی یہ بہترین مثال ہوگی۔ قرآن ہم بھی پڑھ سکتے ہیں سیل کا انگریزی ترجمۂ قرآن خاصہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر مجھے تو اس کے مطالعہ میں بالکل لطف نہ آیا۔ اسقدر پریشان خلط بحث۔ بے ربط۔ پیچیدہ۔ مغلق۔ مطالب کی تکرار غرض یہ کہ بالکل مخبوط الحواس ہے کوئی یوروپین اسے ایک ناگزیر فرض ہی سمجھکر پڑھے تو پڑھ سکتا ہے، جس طرح کسی بڑے انسان کے سوانح حیات کا مواد مہیا کرنے کے لئے سرکاری دستاویزات کی بہت سی بے معنی باتیں صرف اس خیال سے پڑھنی پڑتی ہیں۔ کہ شاید اس شخص کے کچھ اہم حالات مل جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن کا ٹھیک اندازہ کرنے میں ہمیں بہت سے موانع درپیش ہیں۔ اور ہمارے بہ نسبت وہ عربوں کو زیادہ بامعنی معلوم ہوتا ہے صحابہ کو قرآن ہڈیوں پر لکھا ہوا بالکل بے ترتیب حالت میں ملا اور انہوں نے زمانہ اور سلسلہ کے تقدم و تاخر کا لحاظ کئے بغیر اسکو اسی طرح شایع کر دیا۔ صرف اس کا ذرا خیال

رکھا کہ بڑی بڑی سورتیں پہلے لکھدی جائیں۔ اس طرح اس کی اصلی ترتیب بالکل الٹ گئی۔ کیونکہ ابتدائی سورتیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں اگر قرآن اپنی اصلی ترتیب سے پڑھا جائے تو ایسا بے ربط نہ معلوم ہو اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ اصلی زبان میں اس کی عبارت نہایت مقفیٰ اور مسجع ہے، جو بہت قابل لحاظ ہے، کیونکہ ترجمہ میں غالباً اسکی خوبی بہت کچھ زائل ہوگئی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کو کوئی شخص صحیفۂ آسمانی کیونکر سمجھ سکتا ہے یا اس پر فصیح و بلیغ کتاب بلکہ سرے سے کتاب کا اطلاق کس طرح ہوسکتا ہے۔ وہ تو ایک نغمۂ پریشاں معلوم ہوتا ہے جو طرزِ تحریر کے اعتبار سے نہایت ناقص ہے۔ یہاں تک تو قومی مذاق کے اختلاف اور معیارِ ذوق کی بحث تھی۔ اس کے باوجود یہ چنداں تعجب خیز نہیں کہ عرب اسے اسقدر عزیز کیوں رکھتے تھے۔ ایکدفعہ آپ قرآن کے ان اوراق پریشاں کو دور رکھدیجئے۔ خود بخود اسکی روحِ رواں آپ پر منکشف ہونے لگے گی اور یہ اس کی ادبی لطافت نہیں بلکہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ دل سے جو بات نکلتی ہے۔ وہ خود بخود دوسروں کے دلوں میں گھر کرلیتی ہے جس کے مقابلہ میں تمام صنعت و معنی آفرینی

کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ قرآن کی پہلی خصوصیت اُسکی اصلیت وصداقت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پریڈو[1] وغیرہ اُسے "فریب کاریوں کا ایسا مجموعہ بتاتے ہیں جس میں شروع سے آخر تک اُس کے مصنف کی پیہم خطاؤں کی توجیہ وتاویل کی گئی ہے اور اُس کی ہوا وہوس کا اظہار کیا گیا ہے۔" لیکن درحقیقت اب وہ وقت آپہنچا ہے کہ ایسی مہمل باتیں چھوڑدی جائیں۔ میں محمدؐ کی دائمی معصومیت کا ادعا نہیں کرتا۔ اس دنیا میں دائمی معصوم کون ہے؟ لیکن میرے نزدیک یہ اتہام لگانا کہ "وہ اکثر یا کبھی جان بوجھ کر مکروفریب کرتے تھے"۔ بالکل صحیح نہیں۔ چہ جائیکہ یہ کہنا کہ "مکروفریب انکا اوڑھنا بچھونا تھا اور انھوں نے محض بازیگری کے طور پر قرآن پیش کیا"۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر غیر متعصب شخص قرآن کو بالکل دوسری نظر سے دیکھے گا۔ وہ اُبال ہے ایک بڑی ناترتیب یافتہ روح انسانی کا۔ ایسے امی اور ناتراشیدہ شخص کا جیسے

---

[1] ہمفری پریڈو (۱۶۴۸ء تا ۱۷۲۴ء) انگریز مستشرق جس نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی اور وہیں سے ۱۶۷۵ء میں ایم۔اے اور ۱۶۸۶ء میں ڈاکٹر آف ڈیوی نٹی (فاضل الہیات) کی ڈگری لی وہ مختلف مذہبی عہدوں پر عرصہ تک مامور رہا اور ۱۶۹۷ء میں آنحضرت کی ایک سوانح عمری لکھی۔

پڑھنا تک نہیں آتا اگر جوش وخروش اور صدق وصفا کیساتھ اظہار ما فی الضمیر میں ساعی ہے، وہ انتہائی جوش وشدت کیساتھ اپنا مطلب ادا کرنا چاہتا ہے بے شمار خیالات کا اس پر ہجوم ہوتا ہے اور ان سب کے اظہار کی کوشش میں وہ کسی کو بھی اچھی طرح ظاہر نہیں کرسکتا۔ اس کے دلی خیالات کسی خاص مضمون کی صورت نہیں اختیار کرتے۔ ان کا کوئی سلسلہ کوئی اصول اور کوئی ربط نہیں ہوتا وہ کوئی صورت ہی نہیں اختیار کرتے بلکہ بغیر کسی ظاہری شکل وصورت کے بالکل درہم برہم اور عسیر الفہم حالت میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہم نے قرآن کو مخبوط المعنی کہا ہے لیکن وہ بالکل مخبوط المعنی نہیں کہا جاسکتا۔ اُسے بے ربط کہنا زیادہ مناسب ہوگا بات یہ ہے کہ مسلسل معرکہ آرائیوں کی وجہ سے آنحضرت[۳] کو خطابت وتقریر میں مہارت حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا آپ پیدا فتادہ لڑائیوں کے باعث ہر وقت انتہائی تعجیل اور روا روی کے عالم میں تھے اس قدر عجلت میں کہ اتنے ایک مطالب کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنانے کی فرصت نہ تھی۔ قرآن عبارت ہے اسی عالم اضطراب کے ارشادات سے جنمیں تئیس ۲۳ سال کے نشیب وفراز کی جھلک پائی جاتی ہے جو بھی

عمدہ پیرایہ میں ادا کئے گئے ہیں اور کبھی خراب ۔

آنحضرت پر رائے زنی کرتے وقت ہمیں یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ اس تیئیس ۲۳ سال کی مدت میں آپ ایک عالم جنگ و جدل میں گھرے ہوئے تھے ۔ کفار سے لڑائیاں، منافقوں کی شرارتیں خود آپ کے دل کا انحراف ان سب باتوں نے آپ کو ہمیشہ سرگرداں رکھا اور آپکی روح کو کبھی چین نہ لینے دیا ایسی حالت میں جبکہ آپ کی روح راتوں کے وقت غلطاں و پیچاں رہتی ۔ اگر ان دشواریوں کا کوئی حل نکل آتا تو آپ کو یہ محسوس ہوتا کہ غیب سے القا ہوا اور اگر آپ کا کوئی عزم مصمم ہو جاتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا جبرئیل وحی لیکر آئے ، ایسا انسان اور جعلسازی کا ارتکاب کرے ! نہیں ! نہیں ! وہ جوش و حرارت بھرا دل جو خیالات کے ایک آتش کدہ کی طرح دہک رہا تھا کسی جعلساز اور بازیگر کا نہیں ہو سکتا ۔ اسکے نزدیک اسکی زندگی اور یہ تمام کائنات ایک مہیب حقیقت تھی ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بہت سی کمزوریاں پائی جاتی ہیں وہ مادر فطرت کا ایک امی اور غیر تربیت یافتہ فرزند تھا جسمیں بدوؤں کی بہت سی خصلتیں موجود تھیں

اس حد تک تو صحیح ہے لیکن یہ کہنا کہ "وہ دیدہ و دل سے محروم ایک دغا باز بہروپیہ تھا جو اپنے حلوے مانڈے کی خاطر شرمناک مکر و فریب کا ارتکاب کرتا جعلی صحائف آسمانی بناتا۔ اپنے خالق اور اپنی ذات کے خلاف پیہم بد خواہی کا ارتکاب کرتا تھا" قطعاً غلط ہے۔

میری رائے میں خلوص، اپنے وسیع ترین معنوں میں قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور اسی وجہ سے عرب اُسے اس قدر عزیز رکھتے تھے۔ یہ ایک کتاب کی پہلی اور آخری خوبی ہے جس سے ہر قسم کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو یہی وہ خصوصیت ہے جس سے کسی طرح کی خوبی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ قرآن کے ان بے ربط روایات۔ الزامات۔ شکایات اور وظائف میں اصلی اور حقیقی بصیرت کی ایک ایسی جھلک نظر آتی ہے جسے شاعرانہ لطافت سے تعبیر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ اس کا بیشتر حصہ محض روایات پر مبنی ہے اور یہہ معلوم ہوتا ہے گویا نہایت دلسوزی اور سرگرمی کیساتھ فی البدیہہ تعلیم و تلقین کی گئی ہے۔ اس میں بار بار گزشتہ پیغمبروں کے وہ حالات بیان

کئے گئے ہیں جو عرب میں مشہور تھے، مثلاً یہ کہ مختلف قوموں کی ہدایت کیلئے ابراہیمؑ ہودؑ۔ موسیٰؑ وغیرہ مختلف پیغمبر یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے جن کے ساتھ ان کی قوم نے ایسا ہی سلوک کیا جیسا کہ آنحضرتؐ کیساتھ آپکی قوم نے۔ جو بڑی حد تک آپکی تسلی کا باعث ہوا۔ ان امور کی قرآن میں اس قدر تکرار ہے کہ جی اکتا جاتا ہے، غالباً سیمول[1] جانسن بھی اپنے کلبہ ویران میں مصنفین کے افلاس کی داستان اسیطرح پڑھکر تسلی حاصل کرتا ہوگا۔ گو قرآن کا جزو اعظم یہی ہے لیکن یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ ہمیں اکثر ایسے تجلیات بھی ملتے ہیں، جو ایک حقیقی مفکر و مبصر کے شایاں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ اس کائنات کی حقیقت سے واقف تھے، اسی لئے آپ صاف وسلیس پیرایہ میں ہمارے قلوب کو بھی اس سے رمز آشنا کردیتے ہیں جس سے آپکا ضمیر پاک روشن تھا۔ آپ نے خدا تعالیٰ کی جو تعریفیں کی ہیں۔ اکثر لوگ اس کے بہت مداح ہیں لیکن میں انھیں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ میرے خیال میں وہ زیادہ تر عبرانی سے ماخوذ ہیں۔ یہ نہیں تو اتنا ضرور ہے کہ عبرانی میں خدا

---

[1] ملاحظہ ہو فٹ نوٹ صفحہ (۳)

کی تعریفیں اس سے بہتر پیرایہ میں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ میں جس چیز کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں وہ انکی نگاہِ حقیقت آشنا ہے، جو قلب اشیاء تک جا پہنچتی ہے اور انکی کنہ سے واقف ہو جاتی ہے۔ یہ قدرت کا وہ عطیہ خاص ہے، جو وہ تمام انسانوں کو عطا کرتی ہے۔ لیکن جسکی ہزاروں میں ایک آدھ ہی قدر کرتا ہے۔ اسی کو میں صحت نظر سے تعبیر کرتا ہوں اور یہی میرے نزدیک قلبِ صادق کی پہچان ہے ؛

آنحضرتؐ سے معجزات ظہور میں نہیں آئے، اور آپ نے اکثر بلا تامل کہدیا کہ "میں معجزے نہیں کر سکتا۔ میں ہادئ خلق ہوں اور میرا کام ان عقائد کو تمام مخلوق تک پہنچانا ہے"۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدا سے آپ کے نزدیک یہ کائنات ایک معجزۂ عظیم رہی چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "اس دنیا کو دیکھو کیا وہ دستِ قدرت کی عجیب و غریب صنعت نہیں ہے؟ یہ ایک نشانی ہے تمھارے لئے اگر تم دیدۂ بینا رکھتے ہو۔ یہ زمین خدا نے تمھارے لئے پیدا کی اور اس پر راستے بنا دیے تم اس پر رہ سکتے ہو۔ اور چل پھر سکتے ہو"

عرب کے گرم ملک میں بادلوں کا وجود آنحضرت کیلئے حیرت انگیز تھا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "بادلوں کے پرے جو سینۂ فلک کی گہرائی سے نکلتے ہیں۔ آخر کہاں سے آتے ہیں؟ سیاہ ابر کے یہ دل کے دل آسمان پر جمع ہوتے اور برستے ہیں۔ جن سے مردہ زمین جی اٹھتی ہے۔ سبزہ لہلہانے لگتا ہے اور کھجوروں سے لدے ہوئے بلند سایہ دار درخت پیدا ہوتے ہیں۔ کیا یہ ایک معجزہ نہیں ہے؟ تمھارے مویشی بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے جو تمھاری خدمت کرتے اور تمھارے لئے غذا اور لباس بہم پہنچاتے ہیں۔ وہ شام کے وقت قطار در قطار گھروں کی طرف لوٹتے ہیں۔ اور تمھارے لئے ایک نعمت ہیں"۔ آپ نے اکثر جہازوں کا بھی ذکر ان الفاظ میں کیا ہے، کہ "وہ بڑے متحرک پہاڑ اپنے کپڑوں کے پر پھیلا کر سرعت کیساتھ پانی پر چلتے ہیں۔ آسمانی ہوائیں انھیں چلاتی ہیں۔ اور جب کبھی خدا تعالیٰ ہوا بند کر دیتا ہے وہ رک جاتے ہیں اور حرکت نہیں کر سکتے"۔

معجزات: آپ فرماتے ہیں کہ "تم لوگ کیا معجزات دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا تمھارا وجود خود ایک معجزہ نہیں ہے؟ خدا نے تمہیں تھوڑی سی مٹی سے پیدا کیا اس سے

پہلے تمھارا وجود بھی نہ تھا۔ پھر جب تم پیدا ہوئے تو بہت چھوٹے سے تھے۔ اسکے بعد تم میں حسن آیا۔ طاقت آئی اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ مگر پھر ایک زمانہ ایسا آتا ہے۔ کہ تم بوڑھے ہو جاتے ہو تمھارے بال سفید ہو جاتے ہیں۔ تمھاری طاقت جواب دینے لگتی ہے۔ اور آخر کار تم فنا ہو جاتے ہو۔ خصوصاً آپ کا یہ جملہ مجھے بہت پسند آیا کہ خدا تعالیٰ نے تم میں ہمدردی کا مادہ پیدا کیا۔ اگر یہ نہ پیدا کرتا تو تم لوگوں کا کیا حال ہوتا۔ یہ ایک نہایت اعلیٰ اور اچھوتا خیال ہے۔ حقیقت اشیاء کی ایک ناد جھلک ہے آپکی طبیعت میں شاعرانہ کمال اور بہترین و صادق ترین خیالات کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آپ ایسی اعلیٰ ذہانت۔ بصیرت اور دل و دماغ کے مالک تھے کہ شاعر۔ بادشاہ۔ مذہبی پیشوا غرض جس قسم کے مشہور انسان بننا چاہتے بن سکتے تھے۔

آپ پر ہمیشہ یہ بات عیاں رہی کہ یہ کائنات سراپا ایک معجزہ ہے جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا اسکینڈی نیویا کے باشندوں اور دوسرے مفکرین کی طرح آپ کی بھی یہ رائے ہے کہ یہ عالم جو بظاہر بالکل حقیقی اور مادی دکھائی دیتا ہے۔ دراصل ذات باری تعالیٰ کے وجود اور قدرت کا صرف ایک مرئی اور محسوس مظہر ہے

فضا کے سینۂ عریاں پر ذات الٰہی کا ایک پرتو ہے اور بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں پیغمبر جناب آپ فرماتے ہیں کہ یہ بڑے بڑے پہاڑ ایکدن بادلوں کی طرح پھٹکر آسمان میں غائب ہو جائینگے" سیل لکھتا ہے کہ عربوں کے عقیدہ کے مطابق آپنے زمین کو چوڑی چکلی بنا دیا ہے جس کے مستحکم کرنے کے لیئے پہاڑ قائم ہیں۔ قیامت کے دن یہ پہاڑ بادلوں کی طرح اڑجائیں گے۔ اور زمین اسقدر گھومیگی کہ تباہ ہو کر گرد وغبار کی طرح خلاء میں غائب ہو جائیگی۔ خدا تعالیٰ اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لیگا۔ اور وہ فنا ہو جائیگی"۔

آنحضرتؐ پر خدا تعالیٰ کا عالمگیر اقتدار ہر وقت عیاں تھا۔ یعنی آپ یہ خوب ہی سمجھتے تھے کہ دنیا کے تمام اشیاء کی اصلی طاقت۔ روح اور حقیقت کی حیثیت سے ہر جگہ ایک ایسی ناقابلِ بیان قوت۔ عظمت اور جبروت موجود ہے جس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ یہی چیز عہد حاضر میں قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے نام سے موسوم کیجاتی ہے۔ اور کوئی آسمانی شئے نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ سرے سے ایک شئے ہی نہیں سمجھی جاتی۔ وہ اشیاء کا ایسا مجموعہ تصور کیجاتی ہے جو صفات ایزدی سے معرا۔ قابل ہیچ دنثری اور بیچارہ ہو۔ موجودہ علوم و فنون کے انہماک میں

اس کا احتمال ہے کہ ہم خدا کو بھلا بیٹھیں۔ حالانکہ اس کو نہ بھولنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر وہی بھلا دیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں پھر کونسی چیز یاد رکھنے کے قابل رہیگی اُس صورت میں تمام علوم بالکل مہمل۔ مردہ اور بیکار ہو جائیں گے، اعتقاد بارتعا کے بغیر بہترین علوم بھی چوب خشک ہونگے نہ کہ درخت سبز جس سے ہر دم نئی لکڑی حاصل ہو سکے۔ انسان کسی نہ کسی طریقہ پر خدا کی پرستش کئے بغیر کچھ نہیں جان سکتا اگر یہ نہو تو اس کا سارا علم و فضل ہیچ ہے۔

اسلام کی ہوس پرستیوں کے متعلق آجتک بہت کچھ کہا اور لکھا گیا جو اصلیت سے زیادہ ہے وہ ہوس پرستیاں جو ہمارے نزدیک جرم ہیں۔ اور جن کی اسلام میں اجازت دیگئی آنحضرتؐ کی قائم کی ہوئی نہیں۔ بلکہ مدت دراز سے بلا روک ٹوک عرب میں رائج تھیں آنحضرتؐ نے انہیں کسی طرح سے محدود و مقید کر دیا۔ اسلام کوئی آسان مذہب نہیں اس میں روزہ داری۔ طہارت سخت اور پیچیدہ مسائل دن میں پانچ دفعہ نماز۔ شراب سے اجتناب غرض ایسے احکام ہیں جن پر نظر کرتے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آسان ہونیکی وجہ سے مقبول ہوا۔ اور ایک اسلام پر کیا منحصر دنیا میں کوئی مذہب یا مذہبی

عقیدہ محض سہل ہونیکی وجہ سے نہیں رائج ہوسکتا۔ یہ کہنا کہ انسان تن آسانی عیش پرستی صلہ کی امید یا مے وانگبین کی لالچ سے (خواہ وہ اس عالم میں ہو یا دوسرے عالم میں) اعمال نیک کی طرف مائل ہوتے ہیں دراصل نسل آدم پر بہتان لگانا ہے۔ ذلیل ترین انسان میں بھی شرافت کا کچھ نہ کچھ جوہر موجود ہوتا ہے۔ ایک غریب سپاہی بھی جو صرف اپنی جان قربان کرنے کیلئے لازم رکھا جاتا ہے۔ ایک خاص عزت رکھتا ہے جو اسکی حقیر تنخواہ اور فوجی قواعد وضوابط سے مختلف ہوتی ہے۔ نسل آدم کا ادنیٰ ترین فرد بھی اپنے دل میں جس چیز کی موہوم سی تمنا رکھتا ہے وہ مے وانگبین کی لذت نہیں بلکہ اعمال صالح کا شوق اور خدا کے ایک نیک بندہ کی حیثیت سے جنت میں داخل ہونیکی آرزو ہے۔ آپ اُسے وہاں تک پہنچنے کا راستہ دکھا دیجئے پھر دیکھئے کہ ایک سست ترین مزدور بھی آسمانِ شہرت پر چمک جاتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان کو تن آسانی کے ذریعہ نیک کاموں کی طرف راغب کیا جاسکتا ہے وہ بنی نوع انسان پر سخت ظلم کرتے ہیں۔ ایثار، شہادت، اور موت ہی وہ موجبات ترغیب ہیں جن سے قلب انسانی متاثر ہوتا ہے اگر اسکی اندرونی

شمع حیات روشن کر دیجائے تو اس سے ایسا شعلہ پیدا ہوگا۔ جو تمام آلایشوں کو جلا دیگا۔ ادنیٰ طبقہ میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ مسرت و شادمانی کارہائے نمایاں کی ترغیب دلانے کے لئے کافی نہیں بلکہ اس سے اعلیٰ تر ذرائع کی ضرورت ہے۔ کسی مذہب کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ انسانوں کی شکم پروری سے نہیں ہوتا بلکہ ان اعلیٰ جذبات کے اکسانے سے جو ہر قلب انسانی میں خوابیدہ ہیں:

کہنے کو خواہ کچھ ہی کہا جائے لیکن محمدؐ کے دامن پر کبھی ہوسناکی کا دھبہ نہیں لگ سکتا۔ سخت غلطی ہوگی اگر ہم آپ کو نفس پرست سمجھیں اور یہ خیال کریں کہ آپ ذلیل عیش و عشرت، نہیں بلکہ کسی طرح کے عیش و عشرت کے عادی تھے، آپ کا اساس البیت بہت ہی ادنیٰ قسم کا تھا۔ آپکی معمولی غذا جو کی روٹی اور پانی تھی۔ بعض دفعہ مہینوں آپ کے گھر میں چولھا تک نہ سلگتا۔ عرب مورخین بجا فخر کیا تھ لکھتے ہیں کہ آپ اپنی نعلین خود درست کرتے اور اپنی عبا پر خود پیوند لگاتے۔ آپ ایک غریب جفاکش اور تنگدست انسان تھے، جنھیں کسی طرح کی محنت و مشقت سے عار نہ تھا۔ غرض آپ کسی حیثیت سے برے نہیں کہے جا سکتے۔ آپ میں تمام خواہشات

جسمانی سے اعلیٰ تر ایک جذبہ کارفرما تھا. ورنہ وہ تند خو عرب جو تئیس [۲۳] سال آپ کے
زیر علم لڑتے رہے اور جنہیں ہر وقت آپ کے ساتھ نشست و برخاست کا موقع ملا.
آپکی اسقدر تعظیم نہ کرتے، وہ آتش مزاج لوگ تھے جو ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے
اور ہر طرح کا فتنہ و فساد برپا کرنے کیلئے تیار ہو جاتے. ان پر بجز قابلیت اور جرات کے
بغیر کوئی شخص حکمرانی نہیں کرسکتا تھا. یہ لوگ آپکو پیغمبر کہتے تھے. حالانکہ آپ ان کے
روبرو بالکل صاف و سادہ حالت میں بغیر کسی نقاب و حجاب کے کھڑے تھے، انہوں
نے آپ کو عبا سیتے. نعلین درست کرتے. لڑتے. مشورہ کرتے حکم دیتے غرض ہر حالت
میں دیکھا تھا. انہیں اس کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہوگا کہ آپ کس قسم کے آدمی تھے.
اس وقت ہم آپکو جو چاہیں کہہ لیں لیکن آجتک کسی شہنشاہ نے تاج مرصع پہنکر
اسطرح حکومت نہ کی ہوگی جسطرح اس خرقہ پوش شخص نے کی ہے میرے نزدیک اسکی
ذات میں اصلی ہیرو کے وہ تمام صفات موجود تھے. جو اسے تئیس [۲۳] سال کی سخت اور
حقیقی آزمائش میں کامیاب کرانے کیلئے ضروری ہیں.

آخری الفاظ جو آنحضرت[ص] کی زبان سے نکلے ایک دعا ہے. ایک قلب مضطر کے

اپنے خالق کی بارگاہ میں چند ٹوٹے پھوٹے جملے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہوگا کہ مذہب اسلام کی اشاعت نے آپکی طبیعت میں کوئی خرابی پیدا کر دی۔ بلکہ اور اچھا اثر کیا آپکے حالات میں بہت سی عمدہ باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً جب آپکی صاحبزادی کا انتقال ہوا تو آپنے اپنے طرز میں جو کچھ فرمایا وہ صداقت سے معمور ہونیکے ساتھ ساتھ عیسوی عقائد سے ملتا جلتا ہے۔ یعنے "اِنّا للّٰہ واِنّا الیہ راجعون"۔ ہم خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ یہی آپ نے اس وقت بھی فرمایا جب آپنے آزاد کردہ محبوب غلام زیدؓ کی وفات کی خبر سنی۔ زید دوسرے مسلمان تھے، یہ غزوہ تبوک میں شہید ہوئے جو یونانیوں[1] سے آنحضرتؐ کی پہلی جنگ تھی۔ انکی شہادت کا حال سنکر آپنے فرمایا "اچھا ہوا کہ زیدؓ راہ خدا میں کام آئے۔ وہ اپنے مالک سے جا ملے اور انکا انجام بخیر ہوا" لیکن اس کے باوجود حضرت زیدؓ کی صاحبزادی نے آپ کو انکی نعش پر روتے دیکھا۔ اور عرض کیا "یا رسول اللہؐ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟" آپ نے ارشاد فرمایا "ایک انسان کو اپنے دوست کی جدائی پر روتا دیکھ رہی ہو"۔

[1] مسلمانوں کی یہ جنگ رومیوں کے مقابلہ میں تھی نہ کہ یونانیوں کے۔

وفات کے دو روز قبل آپ آخری مرتبہ مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا کہ اگر میں نے کسی کو اذیت پہنچائی ہے تو وہ مجھ سے آج بدلہ لے لے۔ اگر میں کسی کا مقروض ہوں تو وہ اپنا قرضہ مانگ لے"۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ "ہاں آپ میرے تین درہم دینا ہیں جو فلاں تاریخ قرض لئے تھے"۔ آپ نے ان کے ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ "آج کی شرمساری روز محشر کی رسوائی سے بہتر ہے"۔

وہ واقعہ بھی آپ لوگوں کو یاد ہوگا جب حضرت عائشہؓ کے استفسار پر آپ نے فرمایا تھا کہ "قسم ہے رب العالمین کی میں خدیجہؓ کو تم سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں"[1] اس قسم کے واقعات آج بارہ صدی کے بعد بھی ہمیں مادر فطرت کے اُس سچے فرزند کی صداقت کا پتہ دیتے ہیں۔ جس کے بنی نوع ہونیکا شرف ہم سب کو حاصل ہے۔

مجھے محمدؐ کا تصنع اور ظاہرداری سے کوسوں دُور رہنا بہت پسند ہے۔ مادر صحرا کا وہ نا تربیت یافتہ فرزند اپنے بل بوتے پر کام کرتا ہے۔ اور اپنی ذات کے متعلق کوئی غلط ادعا نہیں کرتا۔ اس میں نہ تو غرور و خودنمائی ہے نہ خوشامد و عاجزی۔ وہ اپنی

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ (۴۳)

اصلی حالت میں پایا جاتا ہے ایک طرف تو وہ اپنی عبا پر خود پیوند لگاتا اور اپنی نعلین کی خود مرمت کرتا ہے، دوسری طرف نہایت بے تکلفی سے ایران کے بادشاہوں اور یونان کے شہنشاہوں کو ان کے فرائض پر توجہ دلاتا ہے۔ غرض وہ اپنے درجہ اور عزت کا پوری طرح علم رکھتا ہے۔ بدوؤں کے ساتھ خون ریز معرکہ آرائیوں میں ظلم و ستم کے بغیر گزر نہیں لیکن اس کیساتھ ہی ہمیں رحم و کرم کی بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں آنحضرتؐ نہ ظلم و ستم پر اعتذار کرتے ہیں۔ اور نہ رحم کرم پر افتخار۔ وہ دونوں آپ کے دل کی اصلی صدائیں تھیں جو ارتجالاً بلند ہوگئیں۔ آپ نے ہمیشہ شیریں زبانی ہی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وقت ضرورت زور اور سختی بھی کی ہے۔ آپ میں لچی لپٹی رکھنے کی عادت نہ تھی۔ غزوہ تبوک کا آپ بار بار ذکر کرتے ہیں۔ اس موقع پر آپ کے ساتھیوں نے اکثر نے چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور گرمی کی شدت اور فصل کے خراب ہو جانیکا عذر کیا تھا۔ آپ اس واقعہ کو کبھی نہیں بھول سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ تمھاری کھیتیاں کتنے دن کام آئینگی؟ ابد تک، انکا کیا حشر ہوگا؟ گرمی کی شدت تو بیشک تھی مگر دوزخ اس سے بہت زیادہ گرم ہوگی"۔ بعض دفعہ آپ نے

طنز سے بھی کام لیا ہے۔ چنانچہ کفار سے فرماتے ہیں۔ کہ "قیامت کے دن تمہیں اپنے اعمال کا پورا پھل ملیگا۔ تمھارے اعمال تولے جائیں گے۔ اور ان میں کسی طرح کی کمی نہ کیجائیگی"۔ ہر بات کا تصور آپ اپنے ذہن میں قایم کر لیتے بلکہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے جس کی عظمت کے احساس سے بعض دفعہ آپ پر سکتہ کا عالم طاری ہوجاتا۔ آپ اکثر "بیّنٰت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور قرآن میں بعض دفعہ یہ لفظ ایک مستقل جملہ کی طرح استعمال ہوا ہے:۔

آنحضرت کے نزدیک زندگی ہنسی کھیل نہیں تھی وہ نجات اور گمراہی کا معاملہ تھا۔ ازل اور ابد کا سوال تھا۔ آپ اس بارہ میں غضب کے سنجیدہ تھے۔ زندگی کو ایک کھیل سمجھنا وہم وقیاس کو دخل دینا۔ تلاش حق میں بے اعتنائی سے کام لینا اور صداقت کے ساتھ تمسخر واستہزا کرنا بدترین گناہ ہے۔ یہ تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ یہ جذبہ ایسے انسان کے دل ودماغ پر چھا وہی ہوتا ہے جسے صداقت کی ہوا نہ لگی ہو۔ جو محض نمود ونمایش کے عالم میں رہتا ہو۔ ایسا انسان نہ صرف جھوٹ تراشتا اور جھوٹ بولتا ہے بلکہ خود کذب مجسم ہے۔ اعلیٰ اصول اخلاق کا شعلہ ایزدی

اُس کے سینہ میں سرد پڑ گیا ہے۔ خاکستر ہو گیا ہے۔ محمدؐ کا کذب و افترا ابھی ایسے شخص کے صدق و صفا سے بہتر ہے۔ وہ ریاکار انسان ہے گو بظاہر نہایت معقول مہذب۔ خوش خلق شیریں کلام اور زہریلے سانپ کیطرح خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔

ہم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ محمدؐ کے اخلاقی اصول ہمیشہ بہترین ہوا کرتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کا میلان ہمیشہ خیر کی طرف ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے قلب کے سچے احساسات ہیں جس کا مطمح نظر صداقت و معدلت رہتا ہے، مثلاً گو اسلام میں مسیحیت کا یہ اعلیٰ اصول عفو نہیں پایا جاتا کہ اگر کوئی شخص ایک طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اسکے آگے کر دیا جائے بلکہ اسلام میں بدلہ لینے کا حکم ہے لیکن ساتھ ہی شرط یہ ہے کہ حد انصاف سے نہ بڑھنا چاہیئے۔ اسی طرح اسلام کامل مساوات کا علمبردار ہے جیسا کہ ایک اعلیٰ مذہب اور مناسب فطرت انسانی کو ہونا چاہیئے۔ اس میں ایک مسلمان کی جان دنیا کے تمام تاج و تخت پر بھاری ہے۔ نیز اسکی رو سے سب بنی آدم یکساں ہیں۔ خیرات دینا اسلام میں صرف جائز نہیں بلکہ لازم ہے۔ اس میں زکوٰۃ کا نصاب بھی معین کر دیا گیا ہے

اور اگر کوئی شخص نہ ادا کرے تو وہ اس کا جوابدہ ہوگا۔ ہر شخص کی سالانہ آمدنی کا دسواں[1] حصہ (خواہ وہ کتنا ہی ہو) غریبوں معذوروں۔ اور محتاجوں کا حق ہے غرض یہ تمام اصول نہایت عمدہ ہیں۔ یہ رحم و انصاف اور محبت و انسانیت کے وہ مطالبات ہیں جن کی صدائے بازگشت مادر فطرت کے اس امّی فرزند سے بلند ہوئی۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام میں بہشت و دوزخ کا جو تصور پیش کیا گیا وہ بڑی حد تک حیوانی ہے۔ جس سے ہمارے روحانی احساسات سخت مجروح ہوتے ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ عربوں میں یہ تصور پہلے ہی سے موجود تھا۔ آنحضرتؐ نے اس میں ایسی تبدیلیاں کیں جن سے وہ معقول و معتدل ہوگیا۔ علاوہ ازیں بہشت و دوزخ کے بدترین لذائذ و مصائب حیوانی آنحضرتؐ کے پیدا کردہ نہیں بلکہ بعض علمائے اُمّت کے ہیں۔ قرآن میں بہشت کی نعمتوں کا بہت ہی مختصر تذکرہ ہے ان کا ذکر اجمالاً

---

[1] زرعی پیداوار جو برساتی پانی سے حاصل ہو اس پر زکوٰۃ دسواں حصہ ہے جو پیداوار مصنوعی ذرائع سے پانی پہنچا کر حاصل کیجائے اس پر زکوٰۃ بیسواں حصہ اور تجارتی آمدنی پر چالیسواں حصہ

آیا ہے نہ کہ نفیاً۔ اسمیں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ جنت کی اعلیٰ ترین نعمت روحانی ہوگی یعنے خدا کا دیدار جو باقی تمام نعمتوں سے بدرجہا افضل ہوگا۔ آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ "تمہیں سلامتی نصیب ہوگی"۔ "سلامتی" ہی وہ شئے ہے جس کا ہر سمجھدار آدمی آرزومند رہتا ہے اور جسے وہ عظیم ترین نعمت سمجھکر اس دنیا میں حاصل کرنے کے لئے سرگردان ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں "تم وہاں نشست گاہوں پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھوگے اور تمام بغض و حسد تمھارے سینوں سے دھو دیا جائیگا۔ تم آپس میں دل کھولکر محبت کروگے۔ تم میں سے ہر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جگہ پائیگا۔ اور جنت کا لطف اٹھائیگا"۔

بہشت کی حیوانی لذتوں اور آنحضرت صلعم پر ہوس پرستیوں کے اتہام کے سلسلہ میں (جو ہمارے لکچر کا سب سے تکلیف دہ حصہ ہے) بہت سی باتیں قابل ذکر تھیں لیکن انکو یہاں بیان کرنا دقت سے خالی نہیں۔ اس لئے میں صرف دو امور کا تذکرہ کرکے انکا فیصلہ آپ پر چھوڑ دونگا۔ ان میں سے پہلی بات کی طرف میرا ذہن گوئیتے کے ایک سرسری اشارہ کی وجہ سے منتقل ہوا

جو بہت قابل لحاظ معلوم ہوتا ہے، وہ اپنی کتاب "سفرنامہ میتر" میں بیان کرتا ہے کہ اس کا ہیرو ایک ایسی انجمن میں پہنچا جس کے اصول عجیب و غریب تھے مثلاً یہ کہ تمام اراکین سے صدر انجمن نے کہا۔ "ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی کسی ایک خواہش پر قدرت حاصل کرے" یعنی کسی ایک بات میں اپنی خواہش کے بالکل برعکس عمل کرے۔ اور اسی کام کے کرنے پر کمر باندھے جس سے اُس کی طبیعت گریز کرتی ہے۔ "اس کے معاوضہ میں ہم آپ سے اور خواہشات کی تکمیل زیادہ وسعت اور آزادی کے ساتھ کرنے کی اجازت دیں گے"۔ مجھے یہ اصول بہت پسند آیا۔ اچھی چیزوں سے لطف اندوز ہونے میں کوئی برائی نہیں۔ برائی اس میں ہے کہ اپنے نفس کو اُن کا غلام بنا لیا جائے۔ انسان اس کا اطمینان کر لے کہ وہ اپنی عادتوں پر قابو رکھتا ہے اور اگر کوئی معقول وجہ بتائی جائے تو ان کو ترک کر سکتا ہے۔ یہ میرے نزدیک بہترین اصول ہے ..... رمضان کا مہینہ (جسے اسلام اور خود آنحضرت کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے) اسی اصول

کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اگر اس سے آنحضرتؐ کا مطلب صاف و صریح طور پر تہذیب اخلاق نہ تھا تو بھی کوئی اعلیٰ اور مفید مقصد ضرور تھا جو اسطرح قابل تعریف ہے ؛

بہشت و دوزخ کے اسلامی تصور کی نسبت ایک اور امر قابل اظہار یہ ہے کہ وہ کیا ہی بھدا اور مادی سہی لیکن حقیقت جاوید کی ایک ایسی تصویر ہے جس کی مثال کسی اور جگہ نہیں ملتی۔ وہ عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی جنت وہ شعلہ ہائے آتشین سے دھکتی ہوئی دوزخ اور وہ جانگداز رونا محشر جس کا آنحضرتؐ نے بار بار ذکر کیا یہ سب کیا ہے ؟ ایک ناتراشیدہ اعرابی تخیل میں اُس عظیم روحانی حقیقت کا موہوم سا پرتو ہے جسے تمام حقائق کی ابتداء کہنا چاہیئے۔ اور جس کے علم و احساس سے محروم رہنا ہم سب کے حق میں زبون ہوگا۔ یعنی اعمال کے دائمی اثرات

اس دنیا میں انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اس کیلئے بے انتہا اہم ہے۔ جس کے اثرات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ وہ اپنی مختصر سی

زندگی میں جنت کی سی بلندیوں تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ اور جہنم کی سی پستیوں تک بھی اور اس ساٹھ سال کی قلیل مدت میں عمر جاوید پنہاں رکھتا ہے۔

یہ تمام امور اس ناتراشیدہ عربی روح[1] پر حروف آتشین سے کندہ تھے۔ شعلہ و برق سے لکھے تھے۔ جو ہر وقت اس کے پیش نظر رہتے۔ انتہائی صداقت و خلوص کے ساتھ وہ انہیں ادا کرنا چاہتا اور نہ ادا کر سکتا۔ وہ انھیں الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے، اور بہشت و دوزخ کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ یہ حقیقت خواہ کسی رنگ میں پیش کی جائے تمام حقائق کی ابتدا ہے، ہر لباس میں قابلِ احترام ہے "انسان کا اصل مقصد اس دنیا میں کیا ہے"؟ محمدؐ نے اس سوال کا ایسا جواب دیا جو بعض مسیحی علماء کو بھی شرما دیتا ہے۔ "بنتھم[1] اور پیلے[2] کی طرح وہ گناہ و ثواب

---

[1] جرمی بنتھم (۱۷۴۸ء تا ۱۸۳۲ء) انگلستان کا مشہور افادی مصلح۔ اس نے ۱۸۱۷ء میں

لیکن سود و زیاں کا حساب نہیں لگاتا کفر و ایمان پر جمع و تفریق کا عمل کرکے
حاصل نہیں دکھاتا کیونکہ ان دونوں میں صرف اچھے اور بُرے کا فرق نہیں
بلکہ موت و حیات، بہشت و دوزخ کا فرق ہے۔ اول الذکر کسی صورت
میں نہ کیا جائے۔ آخر الذکر کسی حالت میں نہ چھوڑا جائے۔ تم انھیں تپ
نہیں سکتے۔ کیونکہ ان کے لئے کوئی مشترک پیمانہ نہیں۔ ایک انسان کے
حق میں دوامی موت ہے۔ اور دوسری ابدی حیات، بنتھم کا نظریہ افادیت
یعنے نفع و نقصان کو نیکی کا معیار قرار دینا بالفاظ دیگر خدا کی اس کائنات کو
آلۂ بیجان بنا دینا انسان کی انتہا اور علوی روح کو خس و خاشاک اور

بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے پراکٹس شروع کی لیکن اس میں کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوا
اور تالیف و تصنیف کا مشغلہ اختیار کیا۔ فزیکل سائنس۔ سیاسیات۔ اصول قانون اور
اخلاقیات کی مختلف شاخوں پر اس نے مختلف بیش بہا تصانیف چھوڑے ہیں ؛

۲؎ ولیم ہیالے د ۱۸۰۵ء تا ۱۸۷۲ء) انگلستان کا ممتاز فاضل دینیات و فلسفہ فیلو اور
لکچرر کرائسٹ کالج کیمبرج مصنف "مذہب فطرت"۔ "اصول اخلاق" وغیرہ

شادی و غم کا پیمانہ کر دینا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ انسان اور اُسکے انجام کا غایط تر اور فرد تر نظریہ کون پیش کرتا ہے محمدؐ یا یہ لوگ ؟ تو میں کہونگا کہ یہ لوگ ۔

میں پھر یہی کہونگا کہ بحیثیت مجموعی اسلام ایک طرح کی عیسائیت ہے اس میں عیسائیت کی اعلیٰ ترین روحانیت کے وہ تمام عناصر موجود ہیں جنہیں اسکی کمزوریاں نہیں چھپا سکتیں۔ اسکینڈی نیویا کا خدائے "آرزو"[1] جو تمام غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا خدا ہے۔ اس کو آنحضرتؐ نے جنت کی صورت میں وسعت دے دی۔ ایسی جنت جو طاعت و زہد کی نشانی ہی اور ایمان و اعمال صالح کے ذریعہ حاصل کیجاتی ہے۔ وہاں پہنچنے کیلئے حسنِ عمل کیساتھ صبر جمیل بھی چاہیئے۔ جو اس سے زیادہ مشکل چیز ہے۔

[1] گرِم نام ایک جرمن ماہر علم صرف کی تحقیق میں ثابت ہوا ہے کہ قدیم باشندگان اسکینڈی نیویا کے اور معبودوں کے منجملہ ایک "ونیش" تھا جس کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ انسانی آرزوں کا پورا کرنا اسی سے متعلق ہے۔

اسکینڈی نیویا کے قبل عیسوی مذاہب پر آنحضرتؐ نے ایک سچے روحانی عنصر کا اضافہ کر دیا۔ اُسے جھوٹا نہ کہئے۔ اس کی غلطیوں پر نظر نہ ڈالئے بلکہ اسکی صداقت کو دیکھئے۔ آج بارہ سو برس سے یہ ساری نوع انسان کی ہمجم آبادی کا مذہب اور مقدمۂ زندگی بنا ہوا ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگوں نے اس مذہب کو صدق دل سے یقین کیا ہے عرب اپنے مذہب پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کے پابند رہنا چاہتے ہیں۔ ازمنۂ اولیٰ کے بعد سے آج تک عیسائیوں کا کوئی فرقہ (بجز موجودہ انگریز پیورٹنز کے) اپنے مذہب کا ایسا پابند نہیں رہا جیسے مسلمان وہ اس پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اور اسی کو اپنی دنیا و آخرت کا دارومدار سمجھتے ہیں۔ آج رات کو قاہرہ کی سڑکوں پر جب پاسبان "کون جا رہا ہے" کا نعرہ لگائیں گے تو جواب میں رہرو کے نام و نشان کیساتھ یہ آواز بھی آئیگی کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ "اللہ اکبر" اور "اسلام" کے الفاظ ان کروڑوں بندگان خدا کے رگ و پے میں سرایت کر گئے ہیں۔ اور انکی روزانہ زندگی کا جزو لاینفک بنگئے ہیں۔ پرجوش مبلغین قوم

دملت میں اُسکی اشاعت کرتے پھرتے ہیں۔ اور ان مذاہب پر
غالب آجاتے ہیں۔ جو درجہ میں اس سے بہتر نہیں ہوتے ؛

عربوں کے حق میں اسلام گویا ظلمت میں نور کا ظہور تھا جس کے اثر سے
ملک عرب پہلے پہل بیدار ہوا۔ ایک غریب گلہ بان قوم جو ابتدائے آفرینش
سے ریگزاروں میں گمنام پڑی پھر رہی تھی۔ اُس کی ہدایت کے لئے
ایک ہمیر و پیغمبر کے لباس میں ایسا پیام دیکر بھیجا گیا جس پر وہ ایمان
لاسکی۔ دیکھو! اب وہ گمنام چرواہے دنیا میں مشہور ہو جاتے ہیں اور
وہ حقیر شتربان سارے عالم پر چھا جاتے ہیں۔ ایک صدی کے اندر عرب
کا سکہ دہلی سے غرناطہ تک جاری ہوگیا۔ اور اس کی شجاعت و ذہانت کا
آفتاب مدت تک ایک عالم پر ضوفشانی کرتا رہا۔ ایمان ایک بڑی
اور جان بخش نعمت ہے۔ جہاں کوئی قوم ایمان لائی کہ اسکی تاریخ
عظمت و رفعت کی داستانوں سے معمور ہوئی۔ عربوں کی قوم۔
آنحضرتؐ کی ذات اور ایک صدی کی مدت بس یہ معلوم ہوتا ہے گویا

ایک چھوٹی سی چنگاری ایسے تودۂ عظیم پر گری جو بظاہر محض انبار خاکستر تھا۔ مگر دیکھنا! وہ انبار آتشگیر مادہ ثابت ہوا جس کے شعلے دہلی سے غرناطہ تک بلند ہوئے اور آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بڑا انسان ایک برق آسمانی ہوتا ہے اور باقی سب لوگ تودۂ ہیزم کی طرح اس کے منتظر رہتے ہیں جنہیں وہ آن واحد میں شعلہ روشن بنا دیتا ہے ؛